مشاہیرِ اہلِ علم کی

محسن کتابیں

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
مولانا سید طلحہؒ (ایم-اے، ایم-او-ایل)
مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ

مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ (ایم-اے)
مولانا اعزاز علیؒ (دارالعلوم دیوبند)
مولانا عبدالعزیز میمنؒ
مولانا عبدالسلام ندویؒ
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ



نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانیؒ
مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ
مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ
مولانا عبدالباری ندویؒ

مرتب جامع

مولانا محمد عمران خان ندویؒ

سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۵ کراچی ۷۴۶۰۰

مشاہیر اہل علم
کی
محسن کتابیں

مرتبہ
محمد عمران خاں، ندوی

فہرست مضامین

اس کتاب کے نیز ہر قسم کی علمی، دینی، اخلاقی، عربی
اردو کتابوں کے ملنے کا پتہ

مکتبۂ جمعیۃ التعاون
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مطبع معارف پریس اعظم گڑھ

طابع محمد اویس وارثی : ناشر محمد عمران خان ندوی : قیمت فی جلد غیر مجلد عہ مجلد عہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

انسانی سیرت کی پاکیزگی اخلاق کی بلندی اور کردار کی پختگی کا واحد موثر ذریعہ اچھی صحبت ہے۔ اسلام سے پہلے بھی جس دور کو ہم جاہلیت کے دور سے تعبیر کرتے ہیں یہ اصول متفق علیہ تھا، مشہور جاہلی شاعر طرفہ اپنے معلقہ میں کہتا ہے :-

عن المرء لا تسأل وابصر قرینہ　　فان القرین بالمقارن مقتدی

اذا کنت فی قوم فصاحب خیارھم　　ولا تصحب الاردی فتردی مع الردی

(یعنی اگر تم کو کسی شخص کے متعلق تحقیق مقصود ہو تو اس شخص کی تحقیق نہ کرو۔ بلکہ اس کے ہم نشینوں کو دیکھو۔ کیونکہ دوست اپنے ہم نشینوں کا متبع ہوتا ہے۔ جیسے ہم نشین ہوں گے ویسا ہی وہ شخص ہوگا۔

جب تم کسی قوم میں ہو تو اس قوم کے اچھوں کی صحبت اختیار کرو، ناکارہ لوگوں کی صحبت میں نہ بیٹھو ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جس میں نیک و بد صحبت کی نہایت دل نشین مثال بیان فرمائی ہے :-

مثل الجلیس الصالح والجلیس السوء کحامل المسک ونافخ الکیر	اچھے اور برے ہم نشین کی مثال مشک فروش اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے۔

فحامل المسك اما ان یحذیك	مشک فروش یا تو مشک دیدے گا یا تم
واما ان تبتاع منه وإما	بقیمت اس کو خرید لوگے ورنہ (کم سے کم)
ان تجد منه ریحا طیبتا ۔	تم کو مشک کی خوشبو ہی (سونگھنے کو) ملیگی ۔
ونافخ الكیر اما ان یحرق ثیابك	لیکن بھٹی دھونکنے والا یا تمھارے کپڑے
واما ان تجد منه ریحا منتنه	جلا دے گا یا اس کی بدبو تم پاؤگے ۔

بعض ماثور اقوال میں تو یہاں تک ہے وحدۃ المرء خیر من جلیس السوء یعنی اگر صالح ہم نشین اور اچھا ساتھی میسر نہ ہو پھر انسان کی تنہائی ہی بہتر ہے ۔

یہ اصول جس طرح اُس وقت صحیح تھا آج بھی صحیح ہے اور اسی ایک اصل کے مفقود ہو جانے سے مسلمانوں کی اخلاقی زندگی میں وہ گھُن لگتا چلا جا رہا ہے جس کو اب وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں ۔ جن کی نظریں پہلے اس طرف نہیں جاتی تھیں ۔

لیکن یہ زمانہ جس کو برعکس نام نہند زنگی کافور کے اصول پر ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے پریس کا زمانہ ہے اور سیرت سازی میں کتابوں، رسالوں اور سفید کاغذ پر سیاہ چھپے ہوئے حروف کو بڑا دخل ہے ۔

ادب کے نام سے، آرٹ کے نام سے، افسانہ کے نام سے، ناول کے نام سے، ادب لطیف کے نام سے اور خدا جانے کن کن ناموں سے، اچھی کتابیں

بہتر طباعت، خوبصورت جلد اور خوشنما گرد پوش کے ساتھ سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں خرافات شائع ہو ہو کر گھر گھر پھیل رہی ہیں، جس سے بڑے چھوٹے، بچّے اور بچیاں اور حد یہ ہے کہ گھروں کی پردہ نشین عورتیں تک متاثر ہو رہی ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے پڑھنے والے طلبہ اور طالبات کا یہ تاثر جس حد پر پہونچ چکا ہے اور اس کے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور اب تو بیشتر عربی مدارس کے طلبہ (کیونکہ ان کے سامنے سے بلند مقصد زندگی اوجھل ہوتا چلا جا رہا ہے) بھی اس کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ عام مدارس میں "فنون" کی کتابوں کے علاوہ طلبہ روشناس ہی کس چیز سے ہوتے ہیں۔ جو علم و مطالعہ کا کوئی خاص ذوق ان میں پیدا ہو؟ اور یہی باعث ہے کہ ان کا مطالعہ بہت محدود اور علم کا دائرہ بہت ہی تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ ایک طرف اچھی صحبت، نیک ساتھی، صالح ہم نشین اور مناسب ماحول کا فقدان ہے اور دوسری طرف پریس کی راہ سے ہر چھپی ہوئی چیز اپنا غیر محسوس زہر پھیلا رہی ہے۔ حقائق بدل رہے ہیں۔ اچھائی اور برائی کے معیار تبدیل ہو رہے ہیں، کل کے معائب آج ہنر بن چکے ہیں، کل تک جن فواحش کا انتساب کسی شریف آدمی کی طرف کرنا اُس کے غصہ وغیرت کی آگ کو بھڑکانے کے مُرادف تھا، آج ان کے کرنے والے

خود اس نسبت کو اپنی طرف کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ جھجک اور شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ فخریہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔

الغرض گندگی اور فحش سب سے زیادہ مؤثر طریقہ پر جس راہ سے اس وقت حملہ آور ہے وہ بھی پریس کی راہ ہے۔ گندہ لٹریچر جس کثرت و وسعت کے ساتھ چھپ اور پھیل رہا ہے اس کے مقابلہ میں صالح لٹریچر کی اشاعت بہت ہی محدود اور انگلیوں پر گنے جانے کے لائق ہے، یہ صورت حال مصلحین و زعمائے ملت کے لیے اولین فکر کی مستحق ہے اور ضرورت ہے کہ اہل قلم اس خامی کو محسوس کریں۔ اخلاق، علم اور دین کی حفاظت کے اس اہم مورچہ کو "اغیار" کے دست برد سے بچانے کی پوری سعی و کوشش کریں۔

فانما الامم الاخلاق ما بقیت
فان ھم ذھبت، اخلاقھم ذھب

پیش نظر کتاب رسالہ "الندوہ" دور جدید کے چند مفید مضامین کا مجموعہ ہے یہ "میری محسن کتابیں" کے زیر عنوان یہ سلسلہ مشاہیر اہل علم کے قلم سے کئی ماہ تک الندوہ میں شائع ہوتا رہا ہے، دینی، اخلاقی اور علمی نقطۂ نظر سے امید ہے کہ ان مضامین کا مطالعہ ہر پڑھے لکھے کے لیے اپنے ذہنی اور فکری معیار کے بقدر مفید ہوگا۔ کتاب میں مضامین کی

ترتیب وہی باقی رکھی گئی ہے جس ترتیب سے یہ الندوہ میں شائع ہوئے ہیں ۔ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا مختصر مضمون الندوہ میں شائع نہ ہوسکا کہ رسالہ بند ہوچکا تھا، لیکن اس کتاب میں وہ شامل کر دیا گیا ہے ۔

آخر میں ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے جو الندوہ میں شائع نہیں ہوا ہے ۔ یہ مضمون میرے محترم کرم فرما مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے ۔ میں ممنون ہوں کہ میری فرمایش اور اصرار سے انھوں نے اس کے لکھنے کی زحمت گوارا کی اور اس طرح یہ مضمون اس مجموعہ میں ایک گراں قدر اضافہ کا باعث ہوا ۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۳ رجمادی الثانی ۱۳۶۵ھ
۲۶ رمئی ۱۹۴۶ء

مرتب
محمد عمران، ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ باغبان تخم بونے سے پہلے اُس کے مناسب زمین کا انتخاب کرتا ہے، انتخاب کے بعد زمین کو سیراب کرتا ہے۔ خس و خاشاک سے پاک و صاف جب اس طرح زمین تیار ہو لیتی ہے تو اُس میں عمدہ تخم تلاش کر کے بوتا ہے۔ پودے کی گرمی سردی سے حفاظت کرتا ہے۔ اُس کے ماحول کو خار و خسک سے پاک صاف رکھتا ہے۔ سیرابی سے اُس کی نشو و نما کو مدد پہونچاتا ہے۔ اس اہتمام سے وہ پودا تناور درخت ہو جاتا ہے جو اپنے سایہ اور پھل سے ایک عالم کو فیض پہونچاتا ہے۔

بعینہٖ یہی حال ایک طالب علم اور اُس کے ذوق و استعداد علمی کے نشو و نما کا ہے۔ سب سے مقدم اُس کے باطن کا بُری خصلتوں سے اور بداخلاقیوں سے پاک صاف ہونا ہے۔ باطن کی صفائی علمی اثرات کے قبول و بارآور ہونے کی ضامن ہے۔ طالب علم کی صفات پر سب سے اول اثر گھر کے ماحول کا ہوتا ہے، اس کے بعد استاد کی صحبت کا جس میں تعلیم و تربیت اخلاق دونوں شامل ہیں۔ بالآخر خود طالب علم کی اُس جد و جہد کا جو وہ خود اپنی تربیت میں کرے۔

یہ تمام اہتمام گویا زمین علم کی تیاری کا تھا۔ پھر مناسب طبیعت علم کا انتخاب

گویا تخم کا انتخاب ہے۔ درس و تعلیم اُس تخم کی نشوونما اور بارآور ہونے کی سعی ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد عرض ہے جو خود ستائی نہیں اظہار واقعہ ہے کہ میں نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ الحمد للہ علمی دینی و ادبی تھی۔ میرے عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم نے (جو میرے مُربّی تھے اللہ کی رحمتیں ہوں اُن پر) علوم عربیہ کی تحصیل ملا حسن تک کی تھی۔ مولانا سید عالم علی صاحب مراد آبادی ہفتوں، بعض اوقات مہینوں بھیکن پور میں قیام فرما رہتے تھے۔ وجہ قیام زیادہ تر معالجہ امراض ہوتا۔ عم محترم حدیث میں اُن کے شاگرد بھی تھے اور سُنا ہے کہ مُرید بھی۔ مولانا محمد لطف اللہ صاحبؒ بھی اکثر تشریف فرما ہوتے۔ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری بھی کرم فرماتے، علیٰ ہذا القیاس۔

دوسرا سلسلہ۔ مولوی عبدالغفور خاں صاحب نقشبندی مجددی کا گھر بھر مُرید تھا۔ ذکر کے حلقے اندر باہر برابر ہوتے۔ مولوی سید حضور احمد صاحب سہسوانی مرحوم کے مواعظ میں مثنوی مولانا رومؒ کی گرمی تاثیر اس قدر تھی کہ قرن گزر جانے پر بھی طبیعت اب تک اس کا احساس رکھتی ہے۔ ایک بڑی سعادت یہ تھی کہ میرے جد امجد محمد خان زمان خاں صاحب نے (جن کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت تھی) میاں سید امین الدین طلبیری کے ذریعہ سے شاہ اسحٰق صاحبؒ مرحوم محدث دہلوی سے شادی و غمی کی رسموں کے متعلق فتویٰ حاصل کیا تھا جو مسائل اربعین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مطابق اپنے برادر معظم حاجی محمد داؤد خاں صاحب مرحوم کی سرپرستی میں رسوم خاندان کی اصلاح فرمائی

تھی جو بفضلہٖ تعالیٰ بہت کچھ اب تک جاری ہے۔ اس طرح ہمارا گھر فضول رسوم سے پاک صاف تھا اور کسی رسم کا اہتمام میں نے اپنے گھر میں نہیں دیکھا۔

میرے والد مرحوم کو ادب اُردو اور تاریخ فارسی کا ذوق تھا۔ ایک انتخاب "سراپا معشوق" کے نام سے شائع کیا تھا جس میں سراپا کے متعلق اُردو شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ تاریخ میں تاریخ فرشتہ، سیر المتاخرین، تزک جہانگیری، روضۃ الصفا، زیر مطالعہ رہیں، شب کے کھانے سے پہلے اور دوپہر کو سوتے وقت لیٹ کر کتاب دیکھتے۔ فرماتے تھے روضۃ الصفا کے وزن سے سینہ دُکھنے لگتا ہے، اپنی صحبتوں میں تاریخی واقعات بیان فرماتے۔

یہ تھی وہ فضا جس میں مَیں نے آنکھ کھولی اور جو آج تک الحمد اللہ آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کے سامنے کوئی دوسری فضا فروغ نہیں پا سکی۔

آمدم برسرِ مطلب۔ سب سے اول جس کتاب کو خود پڑھا وہ مرزا غالب کی اردوئے معلیٰ تھی۔ والد مرحوم نے دیکھنے کو عنایت فرمائی تھی۔ یہ سمجھیے کہ کتاب دیکھنے کے شوق کی یہی بنیاد تھی بحض ابتدائی عمر تھی۔ پوری طرح سمجھتا بھی نہ تھا تاہم دیکھے جاتا تھا۔ اس سے ایک ادبی ذوق کا پیدا ہونا بیّن احساس تھا۔

عم محترم کی صحبت میں فقہ اور دینی مسائل کی تحقیق و بحث رہتی تھی، رسمی مناظروں سے اور ان کے انداز سے ہمیشہ احتراز رہا۔ اس کا اثر بھی میری طبیعت قبول کرتی تھی۔

"اُردوئے معلیٰ" کے ذوق کے سلسلہ میں ہوشیار ہونے کے بعد مرزا غالب کی انشا عودِ ہندی پڑھی اور بہت پڑھی۔ جب انگریزی شروع کی تو اپنے استاد حاجی عبدالرشید خاں صاحب

مرحوم کے شوق دلانے پر اُردو مضامین لکھے اخباروں میں چھپوائے۔ اُسی زمانہ میں تذکرۂ آبحیات مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کا استادِ موصوف کے پاس آیا اور انھوں نے شوق سے اس کو پڑھا۔ اُن کے شوق سے مجھ کو بھی شوق ہوا، پڑھا اور خوب پڑھا، پہلا ایڈیشن بھی دیکھا اور دوسرا بھی۔ آگے چل کر "دربار اکبری" پڑھی شوق اور غور سے۔

اب علی گڑھ کی آمدرفت شروع ہوگئی تھی، وہاں سرسید احمد خاں مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ سید صاحب کے مذہبی خیالات تو دل نے نہیں لئے لیکن ادبی اور تعلیمی کوششوں کی عظمت محسوس ہوئی جو اب تک تازہ ہے۔ بڑی نعمت مولانا شبلی صاحب مرحوم کی صحبت تھی۔ یہ موصوف کے ورودِ علی گڑھ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے موصوف کو کشتی کے اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ ہر صحبت میں ادبی و تاریخی تذکرے رہتے تھے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" "المامون" "الفاروق" "سیرۃ النعمان" "شعرالعجم" کا مطالعہ کیا۔ تبصرے لکھے، ان کتابوں کے مطالعے میں کلام کی برجستگی، مؤرخانہ بیان، اور وقائع نگاری کی قوت نے خصوصاً دل پر عمیق اثر ڈالا۔

تحصیلِ درس نظامی کے سلسلہ میں بہت سی انتہائی کتابیں دیکھیں، پڑھیں، یہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ تکمیل درس نظامی نہیں ہوئی۔ دوران درس میں دل و دماغ نے منطق و فلسفہ کے مباحث کا اثر بہت کم قبول کیا۔ طبیعت حقائق و واقعات کی جویا رہی۔

اس طویل تمہید سے یہ واضح کر دینا مقصود تھا کہ جن کتابوں کا اثر ہوا کیوں ہوا، اور جن کا نہ ہوا کیوں نہ ہوا، ایک ہی کتاب کو بہت سے لوگ پڑھتے ہیں اثر مختلف لیتے

ہیں۔ ایک ہی کتاب ایک دل میں خشیت الٰہی، پاکیزگی اخلاق اخلاص پیدا کرتی ہے، دوسرے دل میں الحاد تمرد اور اخلاق رذیلہ اُسی کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فرق کیوں ہے؟ کتاب ایک مطالب وہی۔ فرق ہے تربیت، استعداد، قابلیت، اور دل و دماغ پر صحبت کے اثر کا۔

قصہ مختصر جو کتابیں میرے ذوق علمی پر کارفرما ہوئیں، محسن بنیں، اور جن کو کہنا چاہیے خاموش مگر سبق آموز استاد تھیں، حسب ذیل ہیں:-

قرآن کریم۔ حدیث، کنز العمال (اس کی جامعیت نے اثر ڈالا) مقالات الاسلامیین امام ابوالحسن اشعری (عقائد) رجال میں ابتداءً بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی دیکھی۔ ازالۃ الخفا رشاہ ولی اللہ صاحبؒ، ابن خلکان، تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی طبقات ابن سعد (تصوف) معارف ابن قتیبہ، مقدمہ شرح البخاری امام ابن حجر عسقلانی۔ حالات مرزا مظہرؒ از شاہ غلام علی صاحبؒ، حالات شاہ غلام علی صاحبؒ از شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ۔ فوائد الفواد خواجہ حسن دہلویؒ، سلسلۃ العارفین ملفوظات خواجہ عبید اللہ احرارؒ، فتوح الغیب حضرت غوث اعظمؒ۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ۔ ملفوظات حضرت پیر و مرشد مولانا فضل رحمٰن قدس سرہٗ (از مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری سید نورالحسن خاں) زبدۃ المقامات خواجہ محمد ہاشمؒ، مدارج السالکین شرح منازل السائرین از حافظ ابن القیم، کتاب الروح ایضاً، اعلام الموقعین ایضاً۔

اُردو۔ اُردوئے معلی، عود ہندی مرزا غالب، تذکرۂ آبحیات، دربار اکبری،

میر محمد حسین آزاد دہلوی، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، شعر العجم مولانا شبلی۔

تاریخ فارسی۔ واقعات بابری، تاریخ فرشتہ، تزک جہانگیری۔

یہ امر قابل اظہار ہے کہ مذکورۂ بالا کتابوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کا کوئی حصہ بوقت ضرورت دیکھا اور پڑھا تاہم اُس کا اثر دل و دماغ پر گہرا ہوا۔

دو کتابوں کا ذکر باقی رہ گیا ہے اُن کا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی ہے، وہ دونوں کتابیں یہ ہیں:۔

(۱) بستان المحدثین شاہ عبد العزیز صاحبؒ دہلوی۔ محدثین کی تصانیف کے بیان میں۔ تصنیف کے ذکر کے ضمن میں مصنف کا ذکر بھی تفصیل و تحقیق سے فرمایا ہے:

یہ کتاب عرصے تک مطالعہ میں رہی۔ بزرگوں کے کتاب خانے سے اتفاقاً پُرانا مطبوعہ نسخہ مل گیا تھا۔ شوق سے برابر پڑھا۔ صاف و سنجیدہ عبارت میں حالات و واقعات تحقیق کے ساتھ بیان فرمائے۔ میرا یقین ہے کہ علمائے سلف وغیرہ رسائل کی تالیف میں جو تھوڑی بہت کامیابی مجھ کو ہوئی اُس کی اصل وہ ذوق ہے جو اس کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوا[۱]۔ رحمہ اللہ تعالیٰ مصنفہ۔

(۲) دو رسالے تصوف کے۔ ایک حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے حالات میں مؤلفہ حضرت شاہ غلام علی صاحب۔ دوسرا حضرت شاہ غلام علی کے حالات میں۔ نوشتہ شاہ عبد الغنی صاحب مجددی۔ یہ رسالے بھی اتفاقاً بزرگوں کی کتابوں میں سے

---

[۱] علمائے سلف کی تالیف میں بستان المحدثین سے بھی مدد لی گئی ہے۔

ہاتھ آگئے تھے۔ سعادت تھی کہ دیکھ کر شوق پیدا ہوا۔ بستان المحدثین کی طرح عرصے تک مطالعہ کیا۔ یہ رسالے بھی مطبوعہ قدیم ہیں۔ حالات صاف اور سنجیدہ عبارت میں مبالغہ اور اغراق سے پاک محققانہ دچشم دید بیان فرمائے ہیں۔ ان رسالوں کے مطالعہ سے یہ ذوق پیدا ہوا کہ تصوف کو بجائے مباحث کے حالات و واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ الحمد للہ یہی ذوق اب تک کارفرما ہے۔ بزرگانِ وقت سے ملنے اور ان کے متعلق خیال و عقیدت کے پیدا ہونے میں بھی یہی ذوق کارفرما رہا۔ رضی اللہ تعالیٰ عن مصنفیہما۔



از مولانا سید سلیمان ندوی

میرے بڑے بھائی مرحوم مولوی حکیم سید ابوحبیب صاحب رضوی مجددی، مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری اور ان کے شاگرد مولوی شاہ علی نعمت صاحب پھلواروی کے شاگرد تھے، اس کا اثر یہ تھا کہ وہ توحید وسنت کے شیفتہ اور دلدادہ تھے اور تمام عمر کامل اتباع سنت اور زہد وتقوی میں گذاری۔

وہ جب فراغت پاکر گھر آئے تو میں بچہ تھا، وہ مجھ سے عمر میں اٹھارہ برس بڑے تھے، میں نے انھیں کے دامن شفقت میں پرورش پائی۔ مسلمانوں میں بدعات کا رواج زیادہ تر عورتوں کے سبب سے ہے اس لئے اُن کو اپنے رشتہ کی بیبیوں اور گاؤں کی دوسری مسلمان بیبیوں کو سمجھانے اور اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اُنھوں نے ہفتہ میں ایک دن ان بیبیوں میں وعظ وتلقین کے لئے مخصوص فرمایا۔ چونکہ میں بچہ تھا، فارسی ختم ہوکر میزان ومنشعب شروع تھی، قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی۔ میں ان بیبیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویۃ الایمان کی ایک ایک بات پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کے ایک ایک مسئلہ کی تشریح وتفسیر فرماتے اور جو وہ فرماتے وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں، اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم ومطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے

مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُن میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالیؒ و رازیؒ و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں دار العلوم آیا، اور دوسرے درجہ میں داخل ہوا، گھر سے کچھ رسالے ساتھ لایا تھا، اُن میں اصول حدیث میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا رسالہ عجالۂ نافعہ بھی تھا، اصول حدیث کے اس مختصر فارسی رسالہ کو پڑھنے سے مجھے علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ندوہ کے کتب خانہ سے شاہ صاحب کی دوسری کتاب بستان المحدثین ہاتھ آئی، بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا، اور بالآخر محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالکؒ نے میرے دل پر قبضہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مؤطا امام مالکؒ سے بے حد گرویدگی پیدا ہوئی۔

ان دنوں دار العلوم کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے اُن کے دار المعلومات میں کچھ کتابیں الگ رکھوا دی گئی تھیں جن کو میں دیکھا کرتا تھا، انھیں کتابوں میں حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ تھی، اُس کے مطالعہ نے محدثین کے کارناموں سے آگاہ کیا۔

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہے کہ کیونکر میرے دل میں رفتہ رفتہ علم حدیث و امام مالکؒ کی مؤطا کا شوق ہوا۔ اسی شوق کا یہ نتیجہ تھا کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں میرا سب سے پہلا مضمون الندوہ میں علم حدیث پر نکلا جس کی تعریف بزرگوں نے فرما کر میرا حوصلہ

بڑھایا اور میری سب سے پہلی کتاب حیات مالکؒ وجود میں آئی۔

اس شوق نے ایک قدم آگے بڑھایا، آخری سال تھا، صحیح بخاری کا آغاز تھا۔ ہمدرس ساتھیوں میں کچھ غالی حنفی تھے اور کچھ مائل الی الحدیث، آخری لقب کا اطلاق خود مجھ پر تھا۔ درجہ میں یہ دونوں قسم کے لڑکے ہر روز اسباق میں اُلجھتے اور سوال و جواب کرتے تھے اور آخر درس گاہ سے اُٹھ کر اپنے اپنے ثبوت کے لئے کتابوں کی طرف دوڑتے تھے۔ دوسرے اشخاص امام طحاوی اور حافظ عینی کا سہارا ڈھونڈھتے تھے اور میں حافظ ابن حجر کی فتح الباری کی پناہ، اسی سلسلہ میں فتح الباری کے مقدمہ کے مطالعہ کی توفیق ملی اور اس کا نتیجہ امام بخاری پر وہ میرا مضمون ہے جو الندوہ ۱۹۰۸ء میں نکلا ہے۔

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف بڑھایا، اور اس سلسلہ میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کے مطالعہ پر آمادہ کیا، میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ بار بار پڑھی کہ اُس کے حواشی اور حوالوں سے اُس کے اول و آخر کے صفحے بھر گئے۔ مولانا شبلی نے ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کے ایک سفر سے واپس آکر مجھے اُس کے انگریزی فرنچ سترجم کا جب ایک تبصرہ دیا اور تعریف فرمائی کہ دیکھو یورپ میں کس وقت نظر سے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں، تو میرے دل میں ایک ٹھیس لگی اور میں نے ابن خلکان پر اس سے بہتر تبصرہ لکھ کر پیش کیا جو الندوہ میں چھپا۔

ہاں شروع میں ایک بات بھول گیا، میرے وطن دیسنہ کے قریب ایک دوسرا

مشہور قصبہ استھانواں ہے، مولانا سید احمد صاحب (استاد و خسر مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار) کی ایک چھوٹی سی کتاب منیۃ الصبیان ہاتھ آئی اس میں مختلف ضرور توں کے عربی الفاظ اور ان کے معنی لکھے ہیں۔ یہ مجھے بڑی انمول چیز ہاتھ آئی میں نے اپنے ہاتھ سے اس کو نقل کیا اور یاد کیا، یہ ادب عربی کی طرف میری توجہ کا پہلا قدم تھا۔ اس کا نتیجہ تھا جب مجھے ادب عربی پر سب سے پہلے لکھنے کا خیال آیا تو اسی طریق پر دروس الادب کی بنیاد ڈالی۔

ادب عربی کی تعلیم مولانا فاروق اور مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم کے زیر سایہ ہوئی، مگر یہ دونوں بزرگ متاخرین کے طرز کے زخم خوردہ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کے حسن توجہ سے جب دلائل الاعجاز جرجانی درس میں پڑھنے کو ملی تو سب سے پہلے متقدمین کا طرز انشا دیکھنے کو ملا، شوق سے پڑھی اور اس کی نقالی کی اور کچھ عربی لکھنے اور بولنے کی شدبد پیدا ہوئی حماسہ اور نقد الشعر نے اس ذوق پر جلا دی اور ان کی پیروی نے نظم کا کچھ انداز پیدا کیا۔

علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے اُن کی تصنیفات پڑھیں، ان کی حوالہ دی ہوئی کتابیں دیکھیں ملل و نحل شہرستانی اور فصل فی الملل والنحل ابن حزم نگاہوں میں رہی، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ سب نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا، بالآخر علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصنیفات نے ہر نقش کو مٹا ڈالا اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا۔

سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا، مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرۃ نبویؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبویؐ اُس کے نقش و نگار ہیں۔ اور اب یہی دونوں میرا سرمایہ اور یہی دونوں میرا زادِ راہ ہیں۔ ایک اصل ہے دوسرا ظل، ایک وحی جلی ہے دوسرا وحی خفی، ایک دلیل ہے دوسرا نتیجہ، جس کو یہ ایک دو نظر آتے ہیں وہ احول ہے۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی

حکم ملا ہے ایک دندر آبادی کو، ایک گم نام اور بدنام، گوشہ نشین قصباتی کو، کہ وہ
بھی اہل فضل وکمال کی صف میں در آئے۔ اور اپنا افسانہ رسوائی دنیا کو کہہ سنائے
اور یہ حکم دینے والے کون! ایک بزرگ[1] اور ایک بزرگ صورت بزرگ سیرت خورد[2]۔
بہتر ہے بزرگوں اور خوردوں کو اگر لطف اسی میں آتا ہے تو لیجئے۔ تعمیل فرمائش
ابھی ہوئی جاتی ہے۔ لیکن آپ حضرات تو بھی سوچ سمجھ لیں۔ دنیا آپ کے حسن انتخاب کو
کیا کہے گی اپنے ہو پسند آئیں ادائیں انھیں دیوانوں کی۔

آنکھ کھلی ایک غلط مذہبی گھرانے میں۔ باپ (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے)
ایک اچھے سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود علماً مولوی اور عملاً دیندار، ماں (اللہ
ان کی عمر میں مزید برکت عطا فرمائے) شب بیدار، تہجد گزار۔ زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے
اخیر کا۔ گھر پر مشرقی تعلیم کا چلن ایک حد تک باقی تھا۔ مولوی صاحب کے پاس پڑھنے
بٹھائے گئے۔ قرآن (ناظرہ) کے ساتھ اردو بھی شروع ہو گئی، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب
میرٹھی مرحوم کی ریڈریں کچھ اس طرح مزہ لے لے کر پڑھیں کہ ان کی شیرینی اب تک
یاد ہے۔ اور اردو ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی لکھنی آگئی۔ اس کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی۔
فارسی میں گلستاں، بوستاں، رقعات قتیل، یوسف زلیخا کے علاوہ کیمیائے سعادت بھی کچھ
سمجھے۔ اور زیادہ تر بے سمجھے جوں توں ختم کر ڈالی۔ داخلہ اسکول میں ہوا، زبان عربی ملی۔

---

[1] مولانا سید سلیمان صاحب ندوی [2] علی میاں سلمہ ایڈیٹر الندوہ۔

اُستاد ملے شفیق۔ عربی سے جو اُلجھن اور وحشت نہ ہونے پائی۔ تصرف ہے انھیں بزرگوں کا۔
ابھی بچپن ہی تھا کہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ "چچا زاد" بھائی نے شوق اخبارات کا پیدا
کرا دیا۔ دل خارجی مطالعہ میں لگنے لگا۔ اخبار، رسالہ، اشتہار، کتاب جو چھپی چیز سامنے آجاتی
مجال نہ تھی کہ بچ کر نکل جائے۔ اردو کے علاوہ انگریزی فارسی عربی میں کچھ نہ کچھ شُدبُد تو
ہو ہی گئی تھی۔ فقہ، تفسیر، تاریخ، تصوف، منطق، مناظرہ، ادب، فسانہ، ناول، ناٹک، طب،
شاعری سب ہی کچھ تو اس میں آگیا۔ جوش خاصہ مذہبی موجود تھا۔ آریوں اور عیسائیوں کی
مناظرانہ کتابوں پر نظر پڑی۔ آگ ہی لگ گئی، تلاش جوابات کی ہوئی۔ دھن ہی سوار
ہوگئی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی ترک اسلام وغیرہ مرزا غلام احمد قادیانی کی سرمہ چشم آریہ
وغیرہ، حکیم نورالدین کی "نورالدین" مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوہ کا ماہنامہ "تحفۂ محمدیہ"
اسی دور کی یادگار ہیں۔ اور ہاں ایک نام تو ذہن سے نکلا ہی جاتا تھا اب وہ بیچارے یوں
ہی گم نام ہوگئے ہیں۔ مولوی احسان اللہ عباسی وکیل گورکھپور، مصنف "الاسلام" "تاریخ الاسلام"
وغیرہ۔ ذوق و شوق سے ساری کتابیں پڑھیں۔ اور اپنی بساط کے لائق کچھ لکھا لکھایا بھی، ادبی
میدان میں شرر مرحوم اور اُن کے معاصرین منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ وغیرہ کا دور دورہ رہا۔
یہ دور کہنا چاہیے کہ سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۰۷ء تک رہا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں نیاز "مقالات شبلی"
اور "الکلام" سے حاصل ہوا۔ اور اسی دم سے جادو مولانا شبلی کا چل گیا۔ تلاش ان کی اور
تحریروں کی شروع ہوئی۔ انھیں پڑھتا نہ تھا تلاوت کرتا تھا۔ "الندوہ" والد مرحوم کے
نام جاری کرا دیا۔ پُرانا پرچہ سُناتا تازہ پرچہ کے لیے دن گنا کرتا۔ مولانا کے ہر مضمون کی ایک

ایک سطر بار بار پڑھتا، فقرے کے فقرے حفظ ہوگئے۔ ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں۔ مہینوں سے کہتا پھرتا۔ بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں۔ نذیر، حالی، سرسید، آزاد کے ساتھ بھی حسن اعتقاد قائم رہا۔

۱۹۰۸ء میں عمر کا سولھواں سال تھا کہ میٹرک پاس کر، لکھنؤ میں کالج میں داخل ہوا۔ اور اب انگریزی کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ اتفاق سے شروع ہی میں ایک بڑے انگریز ڈاکٹر کی کتاب سامنے آگئی۔ ظالم نے کھل کر اور بڑے زور دار الفاظ میں مادیت کی حمایت اور مذہب و اخلاق دونوں سے بغاوت کی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ عصمت اور نیک چلنی کے کوئی معنی نہیں محض پرانے لوگوں کا گڑھا ہوا ڈھکوسلہ ہے۔ اصل شئے صحت اور مادی راحت ہے صحت کا خیال رکھ کر جو کچھ جی میں آئے کر و نکاح وغیرہ کی قیدیں سب لایعنی ہیں مصنف کے پیش نظر اسلام یقیناً نہ تھا۔ لیکن زد تو بہر حال اسلام پر پڑتی ہی تھی۔ خیالات ڈانواڈول ہونے لگے، اسی زمانہ میں اتفاق سے ایک اور کتاب بھی نظر سے گزری۔ یہ ادبی تھی۔ مشاہیر عالم کے اقوال وخیالات پر اس میں ایک جگہ پورے قد کی تصویر صفحہ بھر پر رسول اللہ صلعم کی درج تھی۔ اور نیچے سند یہ بھی تھی کہ فلاں (غالباً روما) کے میوزیم میں قلمی تصویر موجود ہے۔ یہ اس کا فوٹو ہے۔ حلیہ یہ تھا کہ سر پر عمامہ جسم پر عبا، تلوار کمر سے بندھی ہوئی، شانہ پر ترکش، ہاتھ میں کمان، تیوروں پر بل پڑے ہوئے۔ آنکھوں سے غصہ بشرہ سے تندخوئی عیاں۔ شان رحمۃ للعالمین الگ رہی، معمولی ترحم دلی اور نیک مزاجی کے آثار بھی یکسر مفقود۔ نیچے سند درج، مغربیت سے مرعوب۔ دماغ کے لئے اب شک و شبہ کی

گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی؟

دماغ پہلے ہی مفلوج ہو چکا تھا، اب دل بھی مجروح ہو گیا۔ ارتداد دبے پاؤں آیا، اسلامیت کو مٹا، ایمان کو مٹا، خود مسلط ہو گیا۔ آریت مسیحیت دوسرے مذاہب سے دل پہلے ہی سے ہٹا ہوا تھا۔ اب کھلم کھلا آزادی اور آزاد خیالی کی حکومت قائم ہو گئی۔ الحاد کا نشہ، بے دینی کی ترنگ "ریشنلزم" (عقلیت) سے پینگ بڑھے "اگناسٹیسزم" (لا ادریت) سے یارانہ گنٹھا۔ لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن (انجمن عقلیئین) کی ممبری قبول کر، سارا وقت ہیوم مل، اسپنسر، ربی، لیکی، ہیگل، رنگ سول، بریڈلا، یوشنر، ڈارون اور یونانی حکماء، ماڈین متشکلین وغیرہ کی نذر ہونے لگا۔ مل کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ لڑکوں میں مل کا حافظ مشہور ہو گیا۔ ایک اور کتاب طب سے متعلق عضویات دماغی (Mental Physiology) پر ایک مشہور انگریز ڈاکٹر کی اس زمانہ میں نظر سے گزری۔ ذکر امراض عصبی و دماغی کا تھا۔ بدبخت نے مرض صرع کے ضمن میں لکھا تھا کہ اس کی علامات کو پرانے زمانہ میں لوگ "وحی الٰہی" سمجھنے لگتے تھے، اور مصرع کے عام قوائے دماغی تو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے، مذہب اور سلطنت دونوں قائم کر سکتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا ——— ارتداد الحاد اور اسلام بیزاری میں اگر کچھ کسر باقی تھی، تو اب پوری ہو گئی۔ ایف۔ اے کے امتحان کی فیس جانے لگی۔ تو فارم میں جہاں مذہب کا خانہ ہوتا ہے وہاں بجائے مسلمانوں کے ریشنلسٹ لکھ دیا!

الحاد، بے دینی یا عقلیت کا یہ دور کوئی ۸۔۔۔ ۱۰ سال تک قائم رہا۔ ایف اے، بی اے کی تکمیل ہوئی[1]

---

[1] انہماک خاص کے مضامین دو تھے ایک منطق دوسرے نفسیات، نفسیات میں سب سے زیادہ اثر امریکہ کے مشہور استاد فن ولیم جیمس کا رہا۔

ایم، اے کی تکمیل نہ ہوئی۔ لیکن تعلیم تو بہرحال فلسفہ سے کی پائی مضمون نگاری، تصنیف، تالیف اُردو اور انگریزی دونوں میں جاری رہی ہوتے ہوتے ۱۹۱۳ء آگیا، آخر سال تھا کہ ایک دوست کی تحریک پر انگریزی میں بودھ مذہب کی کتابیں دیکھیں اور دل کسی قدر اُدھر مائل ہوا۔ معاً بعد ہندو فلسفہ کا مطالعہ شروع ہوگیا۔ خصوصاً مسز بسنٹ اور بنارس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے انگریزی تراجم و تالیفات کے ذریعہ سے مغربیت، مادیت اور عقلیت کا جو تیز نشہ سوار تھا، وہ بتدریج ہلکا ہونے لگا۔ اور دل اس کا قائل ہوگیا کہ مادی اور حسّی دنیا کے علاوہ بھی کسی اور عالم کا وجود ہے ضرور بھگوت گیتا کا انگریزی ایڈیشن (مسز بسنٹ کا ترجمہ) اس حیثیت سے اکسیر ثابت ہوا۔ خدا کا نام اب قابل مضحکہ نہ رہا۔ "روح اور روحانیت" کے الفاظ سے نفرت و بیزاری دور ہوگئی۔ ہاں اسی درمیان میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول شائع ہوچکی تھی اسے خوب غور سے پڑھا تھا۔ اور اس سے بھی ایسا اثر قبول کیا تھا۔ صاحب سیرۃ کی رسالت پر ایمان تو اب بھی دور کی چیز تھی، لیکن مارگولیس وغیرہ کے اثر سے (نعوذ باللہ) جو ایک خداع اور خونخوار سردار کا تصور قائم ہوگیا تھا۔ آنکھوں سے یہ زنگ اسی سیرۃ کے مطالعہ کی برکت سے کٹ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک خوش نیت مصلح قوم کے تخیل نے لے لی تھی۔

اب دل مسلمان صوفیہ کے اقوال و احوال میں بھی لگنے لگا تھا کشف و کرامت کے ذکر پر اب یہ نہ ہوتا کہ بے ساختہ ہنسی آجاتی بلکہ تلاش اس قسم کے ملفوظات و منقولات کی رہنے لگی۔ فارسی اور اُردو کتابیں بہت سی اس سلسلہ میں پڑھ ڈالیں۔ مسلمان تو اب بھی تھا

لیکن طغیان و عدوان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ محسن کتابوں کے سلسلہ میں محسن شخصیتوں کا ذکر یقیناً بے محل ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر آگے بڑھا نہیں جاتا کہ اس دور میں دو یا تین زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت تدریجی رفتار سے سہی، لیکن بہر حال اصلاحی ہی اثر قبول کرتی رہی۔ ایک اُردو کے مشہور حکیم و ظریف شاعر اکبر الہ آبادی ہیں۔ دوسرے کامریڈ کے اڈیٹر اس وقت کے "مسٹر" اور اسی درمیان میں "مولانا" ہو جانے والے محمد علی۔ ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمید الدین مفسر قرآن کا بھی پڑتا رہا۔

۱۹۱۹ء قریب ختم تھا کہ ایک عزیز کے پاس مثنوی معنوی (کانپوری ایڈیشن) کے چھ ضخیم دفتر دکھائی دیے (اللہ رحمت اللہ رعد کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے) کاغذ، کتابت، طباعت کے ہر حلیہ محاسن ظاہری سے آراستہ، حاشیہ نہایت مفصل۔ چند سال ادھر توجہ بھی نہ کرتا لیکن اب زمین پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ معدہ کو غذا گھنٹہ اور منٹ کی پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت سے ملی بمطالعہ ذوق و شوق سے شروع کیا۔ اور ہر ہر قدم پر شوق کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ الفاظ ملنے مشکل ہیں جن میں اس ذوق و شوق کی کیفیت بیان کی جائے۔ فارسی استعداد واجبی ہی تھی۔ سلوک و معرفت کے نکات و اسرار الگ رہے۔ ظاہری لفظی معنی بھی صدہا ہزارہا اشعار کے سمجھ میں نہ آئے لیکن انہماک کا یہ عالم کہ ایک شعر بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہتا۔ اور دل بے اختیار یہ چاہتا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سارے دفتروں کو ایک دم سے چاٹ جاؤں، کھانے پینے، ہلنے چلنے تک کا ہوش نہ رہا۔ طبیعت بے قرار کہ کمرہ بند کیے بس اسی کو شروع سے آخر تک

پڑھے چلا جاؤں، ہر ہر شعر تیر و نشتر بن کر دل کے اندر پیوست ہوتا جاتا اور تشکیک، ریتیابت "عقلیت" و لاادریت کے بادل ایک ایک کر کے سب چھٹتے چلے جاتے، حاشیے علمی تنگ کے دل کو زیادہ نہ بھاتے، خصوصاً شیخ ابن عربی کے نظریات جہاں آجاتے تو وہاں دَم اُلجھنے لگتا کہ یہ تو پھر وہی افلاطون وغیرہ کے طرز کی باتیں آگئیں جن سے گھبرا کر اور اکتا کر میں بھاگا تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے چھوٹے سادے اور پُرمغز حاشیے جہاں نظر پڑ جاتے، طبیعت پھڑک جاتی۔ اور دل گواہی دے اُٹھتا کہ بے شک یہ قول سچے ہی کا ہو سکتا ہے۔

مولانا نے حضرت رسالت کے باب میں کہا ہے۔ کہ اس پر کسی معجزہ یا خارق عادت سے دلیل خارجی لانے کے کیا معنی پیمبر کی تو ہر ہر چیز بجائے خود ایک معجزہ ہوتی ہے۔ ع

روے و آواز پیمبر معجزہ ست

بس اپنا بالکل یہی حال خود مثنوی سے متعلق تھا۔ ہر شعر خود پکار کر شہادت دے رہا تھا کہ میں سچے ہی کی زبان سے نکلا ہوں، کسی اور دلیل و برہان کی حاجت ہی نہ تھی — مثنوی کا مطالعہ ہفتوں نہیں، مہینوں مسلسل جاری رہا۔ اور اس ساری مدت میں ایک نشہ سا سر پر سوار رہا۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے بس اسی کی دُھن۔ اسی عالم میں کہیں مر گیا ہوتا۔ تو عجب نہیں کہ نکیرین کے سامنے مذہب کے سوال پر جواب زبان سے یہی نکلتا کہ وہی مذہب ہے جو مولانائے روم کا مذہب تھا" قرآن اور رسالت تک پر بھی ایمان پختہ نہ تھا، بس دلیل سب سے بڑی یہی تھی کہ جب صاحب مثنوی اس پر ایمان رکھتے ہیں تو کیوں نہ یہ دین سچا ہوگا۔

غالباً اگست ۱۹۱۹ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن پڑھنے میں آیا اور طبیعت نے اس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا۔ مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسیوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ و تفسیر سے دور ہوگئے، اور یہ رائے اب تک قائم ہے۔ اس بیس سال کے عرصہ میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی عبارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اس ترجمہ و تفسیر کی، علم میں آچکیں۔ لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اس کے مفید اور بہت مفید ہونے میں اب بھی ذرا کلام نہیں — ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صریح غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے۔ تو یہ تو بہرحال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بنا پر ان کی ساری کوشش سے بدظن ہو جانا قرین انصاف و مقتضائے تحقیق نہیں۔

نیم مسلمان ہو چکنے کے بعد پھر پورا مسلمان بن جانا اور ادخلوا فی السلم کافۃ کے تحت میں آجانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ اقبالؒ کی اردو اور فارسی نظمیں۔ محمد علیؒ کی نظمیں اور تحریریں (خصوصاً زمانہ نظربندی ۲۳-۱۹۲۱ء کی) سب اپنا اپنا کام کرتی رہیں، دل میں گھر کرتی گئیں۔ یہاں تک کہ مکتوبات مجددی نے اس پر پوری مہر لگادی۔ مکتوبات کا جوامر تسری نسخہ متعدد جلدوں میں پیش نظر رہا، وہ اپنی صفائی، خوشنمائی اور کثرت حواشی کے لحاظ سے گویا مثنوی ہی کے اسی کانپوری ایڈیشن کی ٹکر کا تھا اور اثر میں شاید اس سے کچھ ہی کم۔ مثنوی سے اگر طبیعت میں ایک شورش اور تڑپ پیدا ہوگئی تھی۔ تو اس میں

سکون اور ٹھہراؤ مکتوبات ہی کی برکت سے حاصل ہوا۔ درمیان میں عطارؒ، سنائیؒ، جامیؒ، شیخ جیلانیؒ، غزالیؒ، سہروردیؒ وغیرہم اکابر شیوخ کی خدا معلوم کتنی کتابیں نظم و نثر کی نظر سے گزر گئیں لیکن دل پر نقش انھیں دو کتابوں کا سب سے زیادہ گہرا بیٹھا، یعنی پہلے مثنوی اور پھر مکتوبات۔ حالانکہ سمجھ میں دونوں کا بڑا حصہ اس وقت تو کیا آتا اب تک نہیں آیا۔

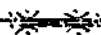
حال کی انگریزی کتابوں میں ایک قابل ذکر کتاب اور یاد پڑ گئی۔ یہ نومسلم یورپین لیوپولڈ و یس محمد اسد کی (Islam on The Cross Road) ہے۔ دیکھنے میں چھوٹی سی معنویت کے لحاظ سے بہت بڑی اور گہری ہے۔ ہر انگریزی خواں کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ بڑی مسرّت اسے پڑھ کر یہ ہوئی کہ جو خیالات تہذیب فرنگ و اسلام سے متعلق پہلے سے اپنے قائم ہو چکے تھے۔ یہ مغربی مفکر بھی گویا تمام تر انھیں کی تائید کر رہا ہے۔

۱۹۲۸ء تھا کہ ایک دوست کی رہنمائی سے پہلے رسائی مولانا تھانوی مدظلہٗ کے مواعظ اور بعض رسائل سلوک تک ہوئی۔ اور پھر ۱۹۲۹ء میں خود مولانا اور اُن کی دوسری تصانیف تک اس نے حقائق دینی و عرفانی کا ایک نیا عالم نظر کے سامنے کر دیا۔ اب ادھر چند سال سے مسلسل مشغلہ اس بے علم و نااہل کا خدمت قرآنی کا ہے۔ اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ہاں اکثر اوراق پر اوراق اُلٹے جانے سے بھی وہ گوہرے نکتے نہیں ملتے۔ جو مفسر تھانوی کے یہاں چند سطروں کے اندر میسّر آجاتے ہیں۔ معاصرت کا ابتلا عجب ابتلا ہے۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے۔ جو دیکھنا نہیں چاہتے۔ انھیں آنکھیں چیر کر دکھایا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ — اور یہ صرف تفسیر یا دوسرے علوم ظاہری ہی پر موقوف نہیں ہے علوم باطنی

میں تو پایہ شاید کچھ بلند تر ہی نکلے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

محسن کتابوں کی تعداد ہے اتنی بڑی کہ سب کی تفصیل لکھی جائے، تو بجائے خود ایک کتاب تیار ہو جائے۔ مختصر بلکہ مختصر تر یہ کہ حدیث میں صحیح بخاری اور اس کی شرح فتح الباری نے آنکھیں کھول دیں اور فقہ میں شرح صدر کے لئے ائمہ حنفیہ کے اقوال بالکل کافی ثابت ہوئے فہم قرآنی میں معروف متداول تفسیروں کو معین و مفید پایا۔ ان کی بے وقعتی خود اپنی محرومی کی دلیل ہے ـــ ان کتابوں کا نام اس بے تکلفی سے لے رہا ہوں کہ گویا سب کو رواں اور صحت اعراب کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں۔ حالانکہ یہ ذرا بھی صحیح نہیں لغات شروح، تراجم کے سہارے کام کسی نہ کسی طرح بس چل ہی جاتا ہے لغت میں تاج العروس اور پھر لسان العرب کے ساتھ اور لغت قرآنی میں مفردات، قرآنی کے ساتھ سب سے زیادہ لگا لپٹا رہتا ہوں۔ انسانی کتابوں کے ساتھ اور ان کے ضمن میں اللہ کی کتاب کا نام آنا اور دونوں میں موازنہ و تقابل کی ٹھہرانا بڑی ہی بدمذاقی ہے اور پھر محسن کتابوں میں "کتابوں" (صیغۂ جمع) کا لفظ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی کتاب موضوع سے بالکل خارج ہے۔



از مولانا عبدالباری صاحب ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

کچھ طبیعت کی افتاد اور کچھ قلت استعداد سے اولاً تو کتابیں کم کیا اتنی کم پڑھی ہیں، کہ آپ یقین فرما سکیں تو نہ پڑھنے کے برابر ہیں۔ ان میں بھی کسی "مردہ کتاب" کا کم از کم شعور کے کسی گوشہ میں اتنا ابھرا کوئی نقش نہیں نظر آتا۔ جو لائق ذکر ہو۔ البتہ ذہنی زندگی کے قریب قریب ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی زندہ انسان ضرور کھڑا نظر آیا۔

حافظہ کی زیادہ تلاشی لینے سے، صرف ایک چھوٹی سی کتاب یاد آئی۔ جو کوئی چوتھائی صدی قبل پڑھی تھی برکلے کی "پرنسپلس آف ہیومن نالج" جس کا نام لینا بھی غالباً آپ پسند نہ فرمائیں۔ اسی زمانہ میں مبادی علم انسانی کے نام سے اس کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کا اولین اثر تو میری بے دینی (ارتیابیت کی توثیق تھی، مگر پھر اسی نے حقیقت علم کے سوال کی طرف متوجہ کر کے حقیقی علم ویقین (ایمان) کا راستہ صاف کیا، بلکہ اور آگے چل کر اسی کتاب کے نظریات و دلائل نے علم ویقین کے اصل سرچشمہ (قرآن) کے بعض اہم حقائق و غوامض کی فہم و یافت میں مدد دی۔ بعد میں الحمد للہ کہ ان کی خود اپنے بہت سے اکابر کے ہاں تصدیق پاکر مزید اطمینان قلب اور شرح صدر نصیب ہوا۔

اصل میں طالب حق کے لئے کلی اصول ایک ہی ہے "الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"، صدق طلب شرط ہے پھر مجاہدہ کی کوئی راہ بھی حق رسی کا بہانہ بن جاتی ہے "سُبل" کی جمع میں بھی اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر اگر کوئی گمراہی کے راستہ پر بھی پڑ گیا ہو، تو وہ بھی اپنی ہی راہ سے "سُبلنا" کی طرف مڑ جاتا یا موڑ لیا جاتا

ہے مجھ کو تو خود اپنے اور اپنے سے زائد احباب میں اس کا مشاہدہ ہوا۔طلب صادق و اخلاص کی بڑی قیمت ہے۔پیاس ہو تو پانی کی کیا کمی۔ ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست   تاکہ آبت جوشد از بالا و پست

البتہ جھوٹی پیاس استسقا کی ہلاکت ہے۔

یہ تو ماضی تھا، حال یہ ہے، کہ "ذٰلِکَ الْکِتٰبُ" کے سوا کوئی کتاب کتاب ہی نہیں معلوم ہوتی۔دعا فرمائیے کہ جو کچھ بھی زندگی رہ گئی ہے۔اسی زندہ کتاب اور اس کے زندہ (حی لایموت) مصنف کے آستانہ پر ختم ہو جائے۔

چونکہ یہ عریضہ آپ کے لئے ہے اس لیے اس عجیب کتاب کے بھی عجیب تجربات، اس خیال سے آپ کی خدمت میں عرض کر دینے کا جی چاہتا ہے۔کہ اگر کسی کی توفیق ہو گئی تو میری مزید تشنگی کا باعث ہوگی۔

ابتدا میں سب سے زیادہ موحش، اس کتاب کا بظاہر بے ربط اسلوب بیان رہا۔ لیکن اب تلاوت کرتا ہوں۔تو جو چیز اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف کو "کلام اللہ" ثابت کرتی ہے، وہ سب سے زیادہ یہی اسلوب بیان (اسٹائل) ہے۔کسی طرح یہ بات تصور میں نہیں آتی کہ کوئی انسان بھی انسانی دل و دماغ اور بشری نفسیات کے ساتھ اس طرح بے تکلف دو چار آیات بھی بول سکتا ہے۔جس طرح یہ کتاب ابتدا سے انتہا تک بے تکلف ایک فوق البشری انداز بیان میں ناطق ہے۔حد یہ کہ لفظی غیر لفظی کوئی ترجمہ خود اسی کتاب جب کسی دوسری زبان میں پڑھتا ہوں۔تو صاف امتیاز ہونے لگتا ہے، کہ ترجمہ کے اندر پھر انسان

شریک ہوگیا۔ تفسیر وغیرہ کا ذکر ہی کیا، اپنا حال تو یہ ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ خود کسی طرح میرے ہاتھ میں ایک کتاب رکھ دیتے اور فرماتے کہ یہ "بین الدفتین" جو کچھ ہے لفظ لفظ حرف حرف میرا کلام ہے۔ تو بھی میرا شکی اور احتمال آفریں ذہن اس کے کلام اللہ ہونے پر شاید ہی اتنا یقین کر سکتا جتنا اس عجیب و غریب اسلوب بیان کی بناء پر حاصل ہے مجھ کو تو اس انداز کلام کا نام ہی بجز کلام اللہ کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔ کاش ایمان اور عدم ایمان دونوں سے اپنے ذہن کو ایک مرتبہ خالی کرکے۔ بلا ترجمہ و تفسیر ممکن بے تعصبی کے ساتھ خود اس کتاب کا مطالعہ کچھ دن جاری رکھ سکیں۔ تو انشاء اللہ ان کی سب بحثیں اور اعتراضات از خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ اگر آدمی اتنی عربی جانتا ہو کہ عربیت کے تحت صحیح معنی سمجھ لیتا ہو، تو پھر ایک ہی ترجمہ و تفسیر کی ضرورت رہ جاتی ہے، کہ انسانی فطرت اور انسانی زندگی کے تحت پیش آنے والے واقعات و تجربات اور ان کی مشکلات و مہمات میں اس کی تفسیر تلاش کرے، تو مومن تو مومن غیر مومن کو بھی یہ اذعان حاصل ہو کر رہے گا، کہ انسانیت جہاں کہیں اور جس حال میں بھی پائی جاتی ہو، اس کی سیدھی راہ وہی راہ ہے جس کی طرف یہ کتاب رہنمائی کرتی ہے۔

ان ربی علی صراط مستقیم

غم و غصہ دونوں زیادہ مسلمانوں کے حال پر آتا ہے، جو اس زندہ کتاب پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور پھر زندگی کا راستہ دوسروں سے پوچھتے اور ادھر ادھر بھٹ

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ ان کو تو صرف اس کی ضرورت تھی، کہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں بس اسی کتاب کو بطور ایک زندہ کتاب کے استعمال کرتے۔

کہنے کی بات نہیں، لیکن آپ سے کہہ دینے کا جی چاہتا ہے، کہ میرا تو یہ حال ہو گیا ہے، کہ لغت اور زبان کے اعتبار سے معانی سمجھ لینے کے بعد۔ یا اگر کوئی واقعہ طلب شئے ہو، تو واقعہ کو سمجھ لینے کے بعد۔ جہاں اور جس مقدار میں اس کلام اللہ کے ساتھ تفسیر وغیرہ کی صورت میں کلام الناس کو شریک کیا۔ اسی قدر ہمیشہ نہیں لیکن زیادہ تر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، کہ جو روشنی ملی تھی اس کی جگہ پھر تاریکی چھانے لگی۔ بس "ماینطق عن الھویٰ" میں اپنا پرایا جتنا ہوائی علم مل جاتا ہے، شاید اتنا ہی خالص وحی کے علم کا حجاب بن کر اُس کے فیضان کو روک دیتا ہے، اس لئے میرے نزدیک، تو مفسر کے علم و تقوے کو معلوم کئے بغیر ہر تفسیر کو پڑھنے لگنا بہت خطرناک ہے۔ الا آنکہ کسی کا علم و تقویٰ خود کافی محافظ ہو۔ اور آج کل تو ہر شخص مفسر ہے، اور ہر اخبار و رسالہ اس کی تفسیر شائع کرنے کے لیے کھلا ہوا ہے۔

ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ پورا قرآن سمجھنے سمجھانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ یقیناً سارا قرآن ساری انسانیت کی ہدایت کے لئے ہے۔ لیکن ہر انسان کے لئے سارا قرآن اسی طرح نہیں جس طرح کرۂ ارض کا سارا رزق ساری انسانیت کیلئے ہے لیکن ہر انسان کے لئے نہیں، اگر ہر آدمی "خلق لکم مافی الارض جمیعًا"، کے تحت سارے آدمیوں کا کیا دو چار کا حصہ بھی ہوس میں آکر کھا جائے تو اکثر صورتوں میں بدہضمی اور بعض میں ہلاکت یقینی ہے۔ ؎

قسمت جو اُست روزی خواہ سے ہر کسے را سوئے دیگر راہ سے

جس طرح ہر جسمانی غذا کا ہر مزاج و ماحول کے انسان کے لئے موافق آنا ضروری نہیں۔ وہی حال روحانی غذا کا بھی ہے، بلکہ ارواح کے الوان و اقتضارات اجسام سے بہت زیادہ کثیر و متفاوت معلوم ہوتے ہیں، ایک شخص دوسرے کا حصہ کیسے پاسکتا ہے۔ ایک موٹی مثال عرض کرتا ہوں "ان من ازواجکم واولادکم عدوا لکم" سے لے کر تغابن کی آخری آیات تک کا ترجمہ تو ہر شخص ہی سمجھ سکتا ہے لیکن جو شخص ازدواجی زندگی کے تجربات سے سرے سے نہیں گزرا۔ یا جس کو "عدوا لکم" سے سابقہ نہیں پڑا، وہ فاحذروھم کے پرہیز یا "وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا" کے علاج کی کیا قدر جان سکتا ہے، اسی طرح "انما اموالکم واولادکم فتنۃ واللہ عندہ اجر عظیم الخ" کا تحقیق فہم اس شخص کو کیسے نصیب ہو سکتا ہے، جو اس فتنۂ اموال و اولاد میں پڑا ہی نہ ہو؛ ذہانت یا دوسروں کے تجربہ سے تفسیر بیان کر دینا اور بات ہے، لیکن ذاتی تحقیق تو بہرحال ذاتی تجربہ ہی کا ثمرہ ہو سکتا ہے۔ اس یافت و تحقیق کی قائمقامی، نہ ذہانت کی کوئی مقدار کر سکتی ہے اور نہ معلومات کا کوئی وسیع سے وسیع سرمایہ۔

ایک اور ذرا باریک مثال لیجئے۔ ایک شخص کا دماغ خالق و مخلوق کے ربط کو سمجھنے کے لئے سالہا سال عقلی آوارہ گردی میں گرفتار رہا، فلسفہ اور مابعد الطبعیات کی راہوں کی خاک چھانتا پھرا، اس کے بعد اس کو "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیٔ علیم" سے اگر کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اس کی پیاس بجھتی ہے۔ اور "بکل شیٔ

علیہ" کے ایک اشارہ سے خالق کی اولیت (آخریت، ظاہریت و باطنیت اور مخلوقات کے ساتھ اس کے ربط و تعلق کی گرہ کھل جاتی ہے۔ تو جس دماغ میں یہ سوال ہی نہیں، اس کو جواب کیا ملے گا۔ یا اس کی کیا قدر ہوگی۔ کیا اس کی کوئی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک فلسفی دماغ کی ہدایت کے لئے قرآن میں کوئی راہ نہ ہو۔

حاصل معروضات یہ ہے کہ مسلمہ عقائد و اعمال کی جس مقدار کی تکلیف ہے اس حد تک تو سب کو تبلیغ و تفہیم مساوی ہونے کی بھی تکلیف ہے۔ باقی قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مختلف الوان و احوال یا مختلف "سُبل" اور راہوں کے لوگ اپنی اپنی خاص راہ سے اس زندہ کتاب کے ذریعہ اپنے زندہ رب سے اپنی زندگی کے سارے کاروبار میں زندہ اور شخصی ربط و تعلق پیدا کریں۔ بغیر اس زندہ ایمان کے نہ عبد و رب میں عبدیت و ربوبیت کا ربط قائم ہوتا ہے۔ نہ ایمان کی حلاوت ملتی ہے، نہ اُس کے اعلیٰ ثمرات پیدا ہوتے ہیں، واللہ اعلم بالحق والصواب۔



از مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

سب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اسلام کے متعلق صحیح واقفیت دی اور ہندو سوسائٹی میں رہ کر میں سولہ برس کی عمر سے پہلے مسلمان ہوگیا، وہ "تحفۃ الہند" ہے۔ تحفۃ الہند کے (میرے ہمنام) مؤلف نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقائد ورسوم کو نقل کرنے کے بعد ہندوؤں کی طرف سے ایک اعتراض نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں بھی مشرکانہ اعمال ورسوم پائے جاتے ہیں۔ اس کا جواب مؤلف نے مختصر طریقہ پر یہ دیا ہے کہ ہم نے ہندو مذہب کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ ان کی مستند مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہے لیکن اس کے جواب میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ اسلام کی مستند کتابوں سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اعمال ورسوم ہیں، جن کا اسلام ذمہ دار نہیں ہے، اور قرآن وحدیث سے ان کی کوئی سند پیش نہیں کی جاسکتی، اس موقع پر میرے ساتھی کو جو میری طرح نو مسلم تھے، توجہ ہوئی کہ وہ اس بات کی تحقیق کریں کہ کیا واقعی اسلام کی مستند کتابیں اس مسئلہ میں بالکل بے داغ ہیں اور اُن میں ان اعمال ورسوم کا کہیں ثبوت نہیں، اس موقع پر ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں صرف قرآن وحدیث کے حوالہ سے اسلام کی توحید پیش کی گئی ہو، خوش قسمتی سے تحفۃ الہند کے بعد جو دوسری کتاب ہمارے ہاتھ میں آئی وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" تھی جو اس سوال کا جواب شافی تھی اور جس سے ہم کو معلوم ہوگیا کہ اسلام کی توحید بالکل خالص ہے اور قرآن وحدیث مسلمانوں کے ان اعمال ورسوم سے بالکل بری ہیں۔

ان دونوں کتابوں سے میں اسلام کے متعلق ایسا صحیح عقیدہ پیدا کر سکا کہ آج تک شاید میں اس میں ایک حرف بھی اضافہ نہیں کر سکا۔

دیوبند کی طالب علمی کے بعد قبلہ نما مولوی محمد قاسم کی کتاب میرے لئے ایک بڑی محسن چیز ہے میں یہ شبہہ خود تو کبھی دل میں نہیں لاسکا کہ بیت اللہ کے سجدہ میں اور بُت پرستی میں کیا فرق ہے؟ مگر جب یہ شبہہ میرے سامنے آیا تو میری طبیعت پوری اس کے حل کرنے کی طرف متوجہ ہوئی، میں جب قبلہ نما پڑھ چکا تو گویا میرا سارا بدن نئے ایمانی نور سے بھر گیا، اس کے بعض چیدہ چیدہ حصے آج تک میں بے نظیر مانتا ہوں، اس کتاب نے میری ذہنیت میں ایک دوسری تبدیلی پیدا کر دی، دانشمندی حاصل کرنے میں جن مصنفین کی کتابیں مدرسوں میں پڑھی جاتی ہیں اُن کے مصنفین کا ایک خاص اثر طالب علم کے دماغ پر پڑتا ہے وہ اُن کی تحقیقات کو بے نظیر چیزیں سمجھنے لگتا ہے، پھر اسی روشنی میں وہ کتاب و سنت سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، مولانا محمد قاسم کو میں نے قبلہ نما میں اس طرح پہچان لیا کہ وہ علامہ تفتازانی، میر سید شریف ایسے بزرگوں سے بہت بڑے ہیں اگر یہ ان کی محقق چیزوں کو نہیں مانتے اور اپنا مسلک ان سے جدا مقرر کرتے ہیں اور اپنے مسلک کی پابندی میں اتنے بڑے مشکل مسئلے کو حل کر دیتے ہیں تو ان کا مسلک ان سے میرے نزدیک بہت زیادہ صحیح اور صاف ہے، یہی جراثیم تھے جو آگے چل کر شاہ ولی اللہ صاحب تک پہونچانے کے باعث بنے اگر میں ان درسی کتابوں کے مصنفین کی تقلید سے آزاد نہ ہو جاتا تو کبھی شاہ ولی اللہ کو امام نہ مانتا۔

اس کے بعد میری محسن کتابوں میں "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس کے زور سے میں قرآن سمجھا۔ فقہ سمجھا، حجۃ اللہ کو میں ایک مرکزی حیثیت سے اپنی محبوب کتاب مانتا ہوں ورنہ شاہ صاحب کی ہر سطر میری محسن ہے۔ حجۃ اللہ کے بعد شاہ صاحب کی کتابوں میں سے الفوز الکبیر، فتح الرحمان، بدور بازغہ کی بہت زیادہ اہمیت میرے دماغ میں ہے۔

محسن کتابوں کے سلسلہ میں اگر میں ان کتابوں کے بعد کوئی کتاب لکھوا سکتا ہوں تو وہ مولانا شہیدؒ کی عبقات ہے جس نے حجۃ اللہ کے مقدمہ کا کام دیا۔

شاہ صاحب کی تصنیفات کے مطالعہ کی ترتیب اور اُنکے مقدمات جس نے سلّم کی شروح پڑھی ہوں اسکا درجہ آج وہی ہے جو پہلے شرح مطالع پڑھنے والے عالموں کا تھا، ایک ذکی نوجوان طالب علم جب درجہ سے فارغ ہو جائے تو اس کو سب سے پہلے شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی تکمیل الاذہان پڑھنی چاہیئے اُس کے بعد عبقات اُس کے بعد سطعات اُس کے بعد البدور البازغہ مگر مقدمہ چھوڑ کر اُس کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کے بعد الفوز الکبیر اس کے بعد فتح الرحمان، فتح الرحمان پڑھتے ہوئے تمام تفسیریں جو ممکن ہوں سامنے رکھ لی جائیں ان کا جو فائدہ غریب اور عام مفسرین سے ایک علیحدہ سی بات معلوم ہو، اس کو خاص طور پر قابل توجہ سمجھا جائے اس نکتہ پر تمام تفسیرین مطالعہ کی جائیں اس کے بعد یہ معین کرنا ہوگا کہ کیا راز تھا کہ شاہ صاحب نے عام مفسرین کا مسلک ترک کر دیا، جو چیز سمجھ میں آجائے اُس کو مستقل محفوظ کر لیا جائے کبھی کسی مخالف کی کوئی بات نہ مانی جائے۔

اس سلسلہ میں مولانا محمد قاسمؒ کی کتابیں بھی ہمارے نزدیک ان حضرات کی کتابوں کی طرف تقریب کرنے والی ہیں، ایک کالج کا طالب علم پہلے یہی کتابیں زیادہ دیکھے، اور جواسے جتنی سمجھ معلوم ہوں انھیں چھوڑتا چلا جائے اور بار بار دیکھے تو وہ شاہ صاحبؒ کی تصنیفات سمجھنے کی استعداد پیدا کرے گا آخر میں تفہیمات الٰہیہ دنیا کے مختلف معرکۃ الآرا مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک اہم تصنیف سمجھنی چاہئے مگر اس وقت ذہنیت اتنی وسیع ہو کہ شیطان سے بھی حکمت سیکھ سکتا ہو۔

شاہ صاحبؒ کا سیاسی مسلک اور ازالۃ الخفار | ہم نے سب سے پہلے ازالۃ الخفار میں اس آیت کی تفسیر بڑے غور سے پڑھی ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علے الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (صف ع ۱) شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں ہم نے جتنا زیادہ غور کیا ہم یہی تفسیر ان کی ساری حکمت سیاسی کا مرکزی نقطہ معلوم ہوا۔

شاہ صاحب کی ازالۃ الخفار میں فاروق اعظمؓ کے مذہب کا جو رسالہ ہے وہ ایک بے نظیر کتاب ہے "میں صحاح ستہ میں سے پانچ کتابوں کو مؤطا کی شرح بناتا ہوں" اس کے بعد مؤطا کو اس فاروق اعظمؓ کے مذہب کی شرح بناتا ہوں، اس سے میرے تمام شکوک حل ہو گئے اور قانون کے مختلف زبانوں میں تبدیلی کی ضرورت صاف ہو گئی۔

فاروق اعظمؓ کے زمانہ کی جو چیز تھی اُسی نے بنی اُمیہ کے آخر دور میں مؤطا کی شکل اختیار کر لی اور مؤطا عباسیوں کے دور میں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی کی

شکل میں تبدیل ہوگئی ہم ان چار حدیث کی کتابوں کو چار انجیلوں کی طرح صحف الٰہیہ میں شمار کرتے ہیں وہ تورات کی تشریح کرتی ہیں یہ قرآن کی تشریح کرتی ہیں مگر اس میں احتیاط کی ضرورت ہے کہ حجۃ اللہ کے قاعدہ پر تلقی کے دونوں طریقوں کو ہر روایت میں جمع کرلیا جائے اس کے بعد فقط مستفیض اور متواتر کو سند بنایا جائے آحاد خبروں کو رائے کے درجہ پر چھوڑ دیا جائے۔ اس میں تبدیلی بقدر ضرورت آسانی سے ہوسکتی ہے۔
ازالۃ الخفاء میں شاہ صاحبؒ نے قرون ثلثہ کی تفسیر کی ہے ہم نے آج تک دوسرے عالم سے یہ تفسیر نہیں سنی، ہم اس کو شاہ صاحبؒ کے بہت اعلیٰ علوم میں شمار کرتے ہیں۔
مجھ سے یورپ میں بارہا سوال کیا گیا کہ قرآن کا آپ کے نزدیک کیا مطلب ہے؟ یعنی میں اپنے فلسفی انداز میں کس طرح تفسیر کرتا ہوں، میرا جواب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک جو کچھ مسلمانوں کی جماعت نے کیا (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک) وہ قرآن کا مقصد ہے اس کی تشریح میں جس فلسفہ سے چاہوں کرسکتا ہوں۔ متن یہ ہے قرآن کا مقصد یہ ہے۔
شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانہ کی رو دیکھ کر شیعہ سنی کا مسئلہ ہاتھ میں لیا، اور اسی کو اپنی حکمت بیان کرنے کا ایک عنوان بنالیا، وہ کہتے ہیں شیخینؓ انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں اس لیے کہ وہ نبیؐ سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اب ضرورت پڑی کہ بتایا جائے کہ نبوت کیا کرتی ہے اور انھوں نے کیا کیا؟ تو حکمت کے دونوں باب حل ہوگئے نبوت کا مطلب بھی متعین ہوگیا اور خلافت راشدہ کا مضمون

بھی صاف آگیا ۔

شاہ صاحب کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابوبکرؓ کے دور کو عمرؓ کے دور کی تمہید سمجھتے ہیں اور عثمانؓ کے دور کو اس کا نتیجہ یا تکمیل اب اس تمام خلافت میں وہ اصلی چیز فاروق اعظمؓ پر توجہ کرتے ہیں اور فاروق اعظمؓ نے چونکہ کسریٰ قیصر کی حکومت فتح کرکے ایک حکومت بنائی تھی جو شاہ صاحبؒ کی تفسیر میں مقصد تھا نزول قرآنی کا تو فاروق اعظمؓ کے کام کو وہ نبوت کے بعد قرآن کا بہترین مصداق مانتے ہیں اور اسی پر وہ ساری قوت صرف کر دیتے ہیں، چونکہ وہ فاروقی ہیں اس لئے وہ پوری ہمت سے اس مسئلہ کو واضح کرنے کی طبعی استعداد رکھتے ہیں اور جب ایک صدیق اعظمؓ کی سیرت ایک صدیق لکھ دے تو پھر نبوت کے بعد بزرگوں کے معیار سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے ۔

شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں صاف نمایاں نظر آتا ہے کہ جس قدر وجدانی فیوض اپنے والد ماجد کے ذریعہ اُن کو حاصل ہوئے اُن میں زیادہ تر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا واسطہ ہے اس لئے وہ ائمۂ اہل بیت سے قلبی محبت صحیح معنے میں رکھتے ہیں مگر ان کے طریقہ کو جس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی ادھر وہ متوجہ نہیں ہوئے ۔ مَیں نے شاہ صاحبؒ کے تتبع میں اس حصّہ کو پُورا کر لیا ہے اور وہ میرے خواص علوم میں سے ہے ۔

دو نادر محسن کتابیں میری ایک محسن کتاب احکام القرآن، ابوبکر رازی ہے

اسلامی سیاست اجتماعی کے بعض ایسے مسائل جو حجۃ اللہ میں رہ گئے رہتے ہیں اسی کتاب سے حل کر سکا۔

یورپ میں میری سیاحت کے لئے مولوی الیاس صاحب برنی کی علم المعیشت بھی ایک محسن کتاب ہے اگر یہ کتاب مجھے نہ ملتی تو میں کسی یوروپین کے اقتصادی پروگرام کو سمجھنے کے قابل نہ ہوتا۔



از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

خاکسار کا خاندان چند پشتوں سے مولویوں کا خاندان ہے، میرے جدِ امجد مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم صوبۂ بہار کے مشہور معقولی مدرس تھے، والد مرحوم تو نہیں لیکن میرے عم مغفور مولانا حکیم حافظ سید ابو النصر گیلانی ؒ درس نظامیہ کے عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تو ان کا کم تھا، لیکن مطالعہ میں مسلسل منہمک رہتے تھے، اس زمانہ کے عام مولویوں کے اعتبار سے ان کے مطالعہ کا دائرہ وسیع تھا، عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی علمی کتابوں کا پڑھ لینا اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتے تھے، اس لئے مولانا شبلی، سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جیسے لوگوں کی کتابوں تک کا مطالعہ بہ شوق کرتے تھے، اگرچہ ان لوگوں کے مستغربانہ میلانات سے متفق نہیں تھے، میں نے ان ہی کے آغوش تربیت میں آنکھیں کھولیں، چونکہ خود لاولد تھے، اس لئے بجائے بیٹے کے مجھے مانتے اور چاہتے تھے، تین ہی سال کی عمر میں جب الفاظ کے تلفظ پر زبان گو نہ قادر ہو چکی تھی، سینکڑوں فارسی کے الفاظ مجھے یاد کرا دیے تھے، یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ تک کتے کو "سگ" کے سوا میں نہیں جانتا تھا کہ کچھ اور بھی کہتے ہیں، بعض دفعہ گھر کی عورتوں کو میری اس فارسی دانی سے کافی مشقت میں مبتلا ہونا پڑا[1]، اسی زمانہ میں دادا مرحوم کے

---

[1] اپنی ننھیال موضع استھانواں میں تھا، عورتیں کسی تقریب میں باہر گئی ہوئی تھیں، گیلانی ہی گھر میں تھا، یا ادھر کوئی کھلائی بھی ہو بہرحال میں نے باورچی خانہ میں کتے کو جاتے دیکھا، عورتیں جب آگئیں تو میں نے اپنی نانی صاحبہ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا "سگ آیا تھا بھات کھا گیا" وہ بیچاری حیران کہ سائل بھات کو کھا گیا کیسا مطلب ہے والدہ مرحومہ میری اصطلاحوں سے واقف تھیں جب وہ آئیں تب مسئلہ حل ہوا ۱۲۔

ایک پنجابی شاگرد ملا عبداللہ مرحوم میرے گاؤں میں توطن پذیر ہو گئے تھے، اور مختلف مؤثرات کے تحت دہلی جاکر مولانا نذیرحسین مرحوم کے حلقہ میں پہونچ کر حنفی مسلک کو چھوڑکر عمل بالحدیث یا غیر مقلدیت کا مسلک اختیار کر لیا تھا، چچا مرحوم سخت غالی حنفی تھے ملا عبداللہ، حالانکہ انھوں نے کچھ پڑھا بھی تھا لیکن مقلدیت و غیر مقلدیت کی بحث میں الجھ کر دونوں میں مختلف کلی اور جزئی مسائل کے متعلق رات دن مباحث کا بازار گرم رہتا تھا خصوصاً طلاق ثلثہ بمجلس واحد مغلظہ ہے، یا رجعی۔ اس نزاع میں تو رسالہ بازیوں تک کی نوبت آئی، طرفین سے متعدد رسالے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے شائع ہوتے رہتے تھے، میں نے جب ہوش سنبھالا اور چچا مرحوم ہی سے مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا، تو میرا علمی ماحول یہی تھا، ابن حجر، ابن قیم، ابن تیمیہ، شوکانی ان باتوں کی بار بار تکرار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں، اور جب ان لوگوں کی یہ حالت تھی، تو پھر بخاری، مسلم، امام ابوحنیفہ، ابویوسف، ابوہریرہ، ابن عمر کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا حال ہوگا، اس بچپنی دور میں مجھ پر سب سے زیادہ کس کتاب کا اثر پڑا، وہ عجیب ہے، فطرتاً میں سخت بدشوق بچوں میں شمار ہوتا تھا چچا مرحوم نے مار مار کے میری کھال تک بعض دفعہ ادھیڑ دی، لیکن پڑھنے کی چوری سے کبھی باز نہ آتا تھا، اتفاقاً ایک اردو کی کتاب جس کے ابتدائی صفحات غائب تھے کہیں گھر میں مل گئی، یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا، اب بھی نہیں معلوم کہ اس کا نام کیا تھا، لیکن اس کا اثر اب تک زندہ ہے۔ قصہ کی کتاب تھی، پورا قصہ تو اب یاد نہیں، ہاں اتنا یاد رہ گیا ہے، کہ

ایک پادری اپنے باغ میں رہتا تھا بچوں کو کچھ پڑھاتا بھی تھا اور بخاری وغیرہ جیسی بعض صنعتیں بھی سکھاتا تھا، طلبہ کو اپنے باغ کے میوے رس بھری وغیرہ کھلاتا تھا، بچوں میں ہرّی اور ٹامی دو خاص کیریکٹر کے لڑکے تھے، ان میں ہرّی سعادت کا اور ٹومی شقاوت کا نمونہ تھا، ہرّی کے جو حالات اس کتاب میں درج تھے ان سے غیر شعوری طور پر میرا دل متأثر ہوا۔ اور اس کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا ایسا محسوس ہوا کہ کاش! ایسی زندگی مجھے بھی میسر آتی، اور اب مجھ میں کچھ پڑھنے کا شوق گدگدی لینے لگا لیکن چچا مرحوم کی بدگمانیوں کا شکار رہتا، پٹائی کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، اور اب اس کے بعد میرے لئے یہ مار دھاڑ بجائے نفع کے باعث نقصان ثابت چلی جارہی تھی اسی عرصہ میں چند دوستوں نے مجھے داستان امیر حمزہ دکھائی، اس کی دلچسپیوں نے مجھے ہوش رُبا کے طلسم میں گرفتار کر دیا مجھ پر تو جو گذرنی تھی گذر گئی لیکن عبرۃً لاُولی الابصار میں ان نتائج کا اظہار ثواب سمجھتا ہوں جو اس طلسم میں گرفتاری کے بعد مجھ پر طاری ہوئے، میری عمر اس وقت غالباً دس گیارہ سال کی ہوگی، جب اس مرض میں گرفتار ہوا، گاؤں کے ایک رئیس بابو ظہور محسن مرحوم کو بھی قصہ کہانیوں کی کتابوں سے حد اعزاز تک دلچسپی تھی، میری بدقسمتی تھی کہ انہوں نے نول کشور پریس کے ان سارے خرافات کو جن کا داستان امیر حمزہ سے تعلق ہے، منگوا لیا تھا۔ کوچک باختر بالا باختر، ہفت پیکر، نور افشاں، ایرج نامہ، اور خدا جانے کیا کیا اب تو سب کے نام بھی یاد نہیں، ہر ایک کتاب تک میری رسائی بآسانی ہو رہی تھی، متعلقہ کتبی اسباق

سب بالائے طاق ہو گئے، صرف ان ہی داستانوں میں غرق ہو گیا۔ چچا صاحب کو
میرے اس انہماک کا احساس ہوا، کچھ نگرانی کرنے لگے، یہ واقعہ ہے کہ بیت الخلا ر
میں کتاب کو چھپا کر رکھ آتا، اور پھر قضاء ضرورت کے حیلہ سے اسی بدبو کدہ میں بیٹھا
ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، رات رات بھر میں نے مدتوں یوں گزاری کہ صبح ہو گئی
اور میں ہوں میری یہ داستان ہے؛ خیر، یہ تو چنداں مضرات نہ تھی اس سے زیادہ اس
کتاب نے ہم پر حملہ کیا، اور طبیعت ان واقعات کی نقل اپنی زندگی میں اُتارنے کی
کوشش کرنے لگی، جن سے یہ کتاب ملو ہے، کیا کیا لکھوں کہ پھر اس راہ میں مجھ پر
کیا گزری حد یہ ہے کہ عیاری جو اس کتاب کا مخصوص حصہ ہے، اور مکر و فریب دھوکہ
چالاکی بھی اس کا خلاصہ ہے، میں نے مدتوں بطور رفضائل کے خود اس کی مشق کی
اور اپنے ہجولیوں میں جو غریب اس کتاب سے ناواقف تھے ان کا امام بن کر مختلف
طریقوں سے ان عیاریوں کی عملی مشق میں مصروف ہو گیا وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ پرواز
بہ مقدار عمر تھی، گاؤں کے باغ اور کھیت میری اور میرے شاگردوں کی عیاریوں کی
جولانگاہ تھے، غریب رکھوالوں کو طرح طرح سے ستایا کرتا، اور اُن کی چیزوں کو
برباد کر کے خوش ہوتا کہ عیاری خوب کامیاب رہی، ابھی شباب اور شبابیات سے
بیگانہ تھا، اگرچہ بتدریج اُن کے آثار چپکے چپکے ابھر رہے تھے، اور شاید میری بربادی
یقینی تھی، اگر ٹھیک عنفوان شباب ہی میں قدرت مجھے اپنے دیہاتی ساتھیوں سے
الگ نہ کر لیتی، پہلے انگریزی تعلیم کا چچا کو خیال تھا، بھاگل پور اسکول میں نام لکھانے

کے لئے بھیجا بھی گیا، انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں دیہات ہی میں ختم ہوچکی تھیں۔ لیکن کسی لطیفۂ غیبی نے میری نا فاقت کی ایسے قدرتی موانع پیش آئے کہ یکایک میری تعلیم کا پروگرام بدل گیا اور اچانک اس طلسمی قید سے نکل کر قدرت نے مجھے بہار سے سیکڑوں میل دور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں پہونچا دیا، یعنی ریاست ٹونک کے مشہور منطقی و معقولی عالم حضرت مولانا برکات احمد بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رشتہ داری کے تعلق سے چچا مرحوم نے پہونچا دیا، پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ کن نامعلوم اسباب کے تحت، ماحول کے اس انقلاب نے میرے دل و دماغ کو بدل دیا، ہوش ربا کی داستان کا قصہ ختم ہوگیا، جو جادو اس کتاب نے مجھ پر چلایا تھا، اس کے اثر سے خود بخود شفایاب ہوگیا اب میرا شمار مولانا مرحوم کے شوقین محنتی ذہین طلبہ میں ہونے لگا، حالانکہ چچا مرحوم کے زد و کوب نے مجھے یہ یقین دلا دیا تھا کہ میں سخت کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں۔ ورنہ صبح و شام اتنی مارکیوں کھاتا، اس سلسلہ میں داستان امیر حمزہ کے عیبوں کے ساتھ اس کے ایک ہنر کا بھی ذکر نہ کرنا ناشکری بھی اور شاید گونہ حق پوشی بھی ہوگی، داستان کے اس طویل سلسلہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو کل تین اجزا پر ساری کتابیں مشتمل نظر آئیں گی، (۱) ایک تو وہی عمرو عیار اور ان کے تلامذہ کے عیارانہ کرتب (۲) امیر حمزہ اور ان کے احفاد و اولاد در اولاد بلکہ عیاروں کے حسن و عشق کے افسانے (۳) فرضی کفار کے مقابلہ میں فرضی مسلمانوں کا فاتحانہ استیلاء، جیسا کہ میں نے عرض کیا، کہ پہلے جزء کے ساحرانہ نتائج کا تو میں شکار ہی ہوگیا

خود بھی ہوا اور کتنوں کو اس نفراک کا نخچیر بنایا، خود تو خیر کم سنی کی وجہ سے صرف باغوں اور کھیتوں تک محدود رہا، لیکن میرے ایک ہجولی میاں معین الدین عرف مناکیلان ہی میں میرے بعد کچھ دن رہے، اور اب تقریباً بیس پچیس سال سے مفقود الخبر ہیں، بعضوں سے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے علاقہ میں پہونچ کر ان پر جذب طاری ہوگیا اور اب ان کا شمار اس علاقہ کے مستجاب الدعوات فقرا میں ہے۔ ان بیچارے کو ٹونک سے واپسی کے بعد پایا کہ گاؤں کی مرغیوں اور بکریوں پر اپنی عیاریوں کی مشق کر رہے ہیں، داستان امیر حمزہ کے شروع میں عمرو عیار کی طرف مرغی پکڑنے کی جو عیاری منسوب کی گئی ہے یہ اسی کی تجلی تھی جو اس بیچارے کے عمل میں آکر جلوہ گر ہوئی تھی، رہا دوسرا جز تو اس وقت ان واقعات سے متاثر ہونے کی پوری صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوئی تھی، البتہ تیسرے جز کا اگرچہ بظاہر عملی طور پر مجھ پر کچھ اثر نہ تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر میری طبیعت نے اس کا اثر کچھ ضرور جذب کیا تھا، اور کفر کے مقابلہ میں اسلام کے اعتلا و سربلندی کے جذبہ سے میرا دماغ اگر کبھی خالی نہ رہا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں اس داستان کے اس جز کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے اگرچہ اسی زمانہ میں چچا مرحوم کے اصرار سے واقدی کی فتوح الشام ومصر وغیرہ کا بھی میں نے مطالعہ کیا تھا۔ اور گو آغاز جبراً ہوا تھا لیکن آخر میں چچا مرحوم کی مرضی کے مطابق کسی چیز کو شوق سے کچھ دن میں نے پڑھا تو واقدی کی یہی کتابیں تھیں اور اس جذبہ میں ان کتابوں کی

تائید بھی ضرور شریک ہے یہ بات کہ اُردو ادب کے اس طویل سلسلے کے مطالعہ نے میری ادبی قابلیت پہ کچھ اثر ڈالا یا نہیں، میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا مجھ میں کسی قسم کا کوئی سلیقہ پیدا نہیں ہوا تھا اور تھوڑا بہت اگر تھا تو وہ چچا مرحوم کی جبری تعلیم کا اثر تھا۔

اس ہوش ربائی داستان سرائی میں طوالت سے میں نے قصداً کام لیا ہے کیونکہ اپنے ان ہی ذاتی تجربات کی بنیاد پر میں ان مسموم ادبی کتابوں اور رسالوں کو نوخیز بچوں اور نوجوانوں کے لیے سم قاتل قرار دیتا ہوں جو حشراتی کیڑوں کی طرح آج آسمان و زمین سے ہر ہر گھر میں برس رہے ہیں۔ بچوں سے آگے بڑھ کر بچیوں تک کی تباہی و بربادی میں بے پناہ طوفانوں کا کام کر رہے ہیں، نسلیں برباد ہو رہی ہیں اور گھرانے اُجڑ رہے ہیں، مگر اس شکل میں کہ ان کا غذی سانپوں اور بچھوؤں سے ماں باپ بخوشی اپنے بچوں کو ڈسا رہے ہیں، حکومت مدد کر رہی ہے، قوم کے لیڈر ایجوکیشن سوسائٹیاں اور خدا جانے کن کن مشنوں سے زہر کے یہ پیالے قوم کے نونہالوں کو بلیغ تقریروں اور فصیح اسپیچوں کے ذریعہ سے پلا رہے ہیں فانا ﷲ وانا الیہ راجعون، کہ تباہی کے اس طوفان کے انسداد کے سارے وسائل ختم ہو چکے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا، ماقدر اللہ فسوف یکون، واذا اراد اللہ بقوم سوءًا فلا مرد لہ وما لہ من وال۔

بہرحال یہ میری جاہلیت کا دور تھا، جو ٹونک پہونچنے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا، اب واقعی علوم و فنون کا شوق مجھ پر مسلط تھا، شوق کی یہ حد تھی کہ باوجود مطبوع ہونے کے میں نے شدت ذوق میں منطق کی بعض کتابیں خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر پڑھیں اور ان ہی دنوں میں ایسا غوجی قلمی پر اپنے استاد کی تقریروں کو اُردو میں بطور حاشیہ کے لکھتا جاتا تھا، جو اب تک میرے کتب خانہ میں بطور یادگار کے محفوظ ہے، مولانا برکات احمد پر مولانا عبدالحق خیرآبادی کے رشید شاگردوں میں ہونے کی وجہ سے خیرآبادی اسکول کے اثرات غالب تھے، منطق و فلسفہ ان ہی دونوں علوم کا ان کے حلقۂ درس میں غلبہ تھا، مجھ پر بھی ان ہی کا تسلط قدرتی طور پر ہونا چاہیے تھا سو ہوا لیکن اسی کے ساتھ یہ چچا مرحوم کی ترکیب تھی کہ خطوط میں بعض خاص علمی و ادبی مسائل و اخبار کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہتے اور گو برکاتی ماحول اس مذاق سے قطعاً ناآشنا بلکہ مخالف تھا، لیکن اس عرصہ میں میرا یہ مشغلہ برابر جاری رہا، چچا مرحوم نے اب سے "الندوہ" کو میرے نام جاری کرا دیا تھا، اور اسی بنیاد پر علامہ سید مجھے ندویوں میں شریک فرماتے ہیں، کہ درساً نہ سہی، قلماً میں ندوہ کا شاگرد رہا ہوں، ایک حیثیت سے سید صاحب کا یہ خیال درست بھی ہے، مولانا برکات احمد کو میری اخبار بینی، اور رسائل خوانی کا اگر کبھی علم ہو جاتا تو بہت برہم ہوتے اور فرماتے ان سطحیات کے دیکھنے سے تو اپنی استعداد بگاڑ رہا ہے، لیکن "چندانکہ مرا شیخ ابوالفرج ابن جوزی" کا جو قصہ سعدیؒ نے گلستاں میں لکھا ہے، میرا وہی حال تھا، تین چار سال تک اس عرصہ میں

مجھے کسی مصنف یا کسی تصنیف سے کوئی خاص لگاؤ پیدا نہیں ہوا، البتہ جب شرح عقائد شروع ہوئی تو میرے ایک پنجابی ملتانی استاد مولانا محمد اشرف مرحوم نے شرح عقائد کی ایک گمنام شرح کا پتہ دیا، اس کا نام نبراس ہے، اور اب بھی لوگ اس سے ناواقف ہیں، یہ ملتان ہی کے ایک غیر معروف بزرگ مولانا عبدالعزیز کی تصنیف ہے اور ملتان ہی سے شائع بھی ہوئی ہے کتاب منگائی گئی، واقعہ یہ تھا کہ اس کتاب میں عام درسی مذاق سے زیادہ مفید چیزیں ملنے لگیں، اور اس کے مطالعہ میں زیادہ لذت ملنے لگی، میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ علم کلام کا تصوف کے نظری حصہ سے جو تعلق ہے سب سے پہلے اس کا سراغ مجھے نبراس ہی کے چراغ کی روشنی میں ملا، اس میں کتابی الجھنوں سے زیادہ واقعات سے دماغوں کو قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی عرصہ میں جلالین شروع ہوئی، چچا مرحوم نے لکھ بھیجا کہ جلالین کے ساتھ رازی کی تفسیر کا مطالعہ جاری رکھو، تفسیر کبیر نے میری آنکھیں کھول دیں، اور مدرسہ کے عام طلبہ میں حاشیہ و شروح کے دور از کار نکات کے حل کرنے کا جو عام مذاق پایا جاتا تھا، اور میں بھی اس مذاق میں مبتلا تھا، اس سے رہائی میسر آئی، حاشیہ نگاروں، شرح بازوں کی وقعت نگاہ میں کم ہونے لگی، امام رازی میرے پہلے رہنما ہیں، جنھوں نے مجھ میں علم کا صحیح مذاق پیدا کیا، لیکن اس وقت تک صرف دماغی راحت کے سامان کی تلاش میں رہتا تھا، دل اور دل کی غذاؤں کا نہ شوق تھا نہ کسی نے ادھر توجہ دلائی تھی، چچا مرحوم پر بھی مولویانہ مذاق غالب تھا اور گو

مولانا برکات احمد پر تصوف کا اچھا خاصہ رنگ تھا، لیکن ان کا درس اس رنگ سے
بیگانہ تھا اس لیے مجھ تک ان کے تصوف کا اثر منتقل نہ ہو رہا تھا کہ اچانک بلقان
کی جنگ چھڑی، ندوہ کے ایک عالم نے ٹونک میں چندہ کی تحریک کی غالباً سید محمد
رائے بریلوی نام تھا، بیچارے کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، متعدد مجمعوں میں اُن
کا وعظ ہوتا تھا، لیکن صحرا کی صدا بن کر رہ جاتا تھا، مجھے ایک دن کچھ غیرت سی
آئی، اور افسوس بھی ہوا۔ اس زمانہ میں الہلال نکل چکا تھا، ٹونک میں سب سے
پہلا پرچہ اس کا میں نے ہی منگایا تھا، ایک جماعت کے ساتھ الہلال کے دلدادہ
میں تھا، مولانا ابوالکلام کے الفاظ طرز بیان کی نقل اتارنے کی صلاحیت محسوس
کر کے میں اچانک پہلی دفعہ پبلک کے سامنے تقریر کے لیے کھڑا ہو گیا، ٹونک کی تاریخ
میں وہ یادگار دن تھا، جامع مسجد بھری ہوئی تھی" وامتازوا الیوم ایہا
المجرمون" کے ساتھ میری کڑکتی ہوئی تقریر کا آغاز ہوا، جو جہاں تھا ٹھٹھر کر
رہ گیا، پھر مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا کہا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہوش آیا تو دیکھتا
ہوں کہ خود رو رہا ہوں اور ساری مسجد میں کہرام برپا ہے، روپیہ کا ڈھیر میرے
قدموں کے سامنے ہے لوگ واقعۃً کپڑے پھاڑ رہے تھے، بال نوچتے تھے
منہ پر تھپیڑ مارتے تھے، ساری مسجد دیوانی ہو رہی تھی، میں خود حیران تھا کہ قصہ
کیا ہے؟ اور آج تک اس کی توجیہ میری سمجھ سے خارج ہے، شاید میرے دبے
دبائے جذبات یکایک اُبھر پڑے یا کیا، میں تقریر بھی کر سکتا ہوں، نہ صرف دستہ لیا

بلکہ خود مجھے پہلی دفعہ اس کا علم ہوا۔ اتفاق سے حضرت الاستاد ٹونک میں نہیں تھے
رہتے تو روک دیا جاتا، مجھے کھلا میدان ملا، عوام نے مجھے اپنا واعظ بنالیا، اور
اب ہر ہر محلے میں جلسے ہونے لگے، اور مجھے تقریر پر مجبور کیا جانے لگا، دو تین تقریروں
تک تو دماغی مواد سے کام لیتا رہا، لیکن اس کے بعد ذخیرہ ختم ہوگیا، بنی ہوئی بات
بگڑتی نظر آئی، مجبوراً خیال گزرا کہ وعظ کی کوئی کتاب دیکھوں خدا کی شان اس راہ میں
پہلی نظر امام غزالی کی احیاء العلوم پر پڑی، اب تک جو رازی کو دنیا کا خاتم العلماء
سمجھتا تھا، چند ہی ابواب کے بعد میرا حال ہی دو سرا ہوگیا، دوسروں کو وعظ سنانے
کے لیے کتاب کھولی تھی، لیکن معاملہ دوسرا ہوا، غزالی کی ہر سطر مجھ پر تیر و نشتر کا کام
کرنے لگی، اور

شد غلامے کہ آب جو آرد آب جو آمد و غلام ببرد

اور دل جو اب تک گویا بھرا بنا ہوا، سینہ میں سویا ہوا تھا، تڑپ اٹھا، میر زاہد
سید شریف، ملا باقر، ملا محمود اور آخر میں امام رازی تک نگاہوں سے اوجھل ہوگئے
اب مجھ پر امام غزالی سوار تھے، وہی دورہ جو طلسم ہوشربا کے مطالعہ میں ابتدائی زندگی
میں پڑا تھا، اب عین جوانی میں جب میری عمر انیس بیس کے درمیان تھی پڑا، اور سخت
پڑا، اب تک گیلان کی زندگی جاہلیت معلوم ہوتی تھی، لیکن اب ٹونک کا عہد بھی
قریب قریب اسی شکل میں نظر آنے لگا، معقولات کا نشہ اتر گیا، زندگی اور سمرِ زندگی
کے حل کا سودا سر پر سوار ہوا، کچھ دن اس کے بعد جبراً قہراً میں نے ٹونک میں گزارے

فرط جنون میں ایک دفعہ ہر چیز سے الگ ہو کر اجمیر شریف بھاگ گیا، خدا غریق رحمت کرے مولانا معین الدین مرحوم کو، میری اس حالت کو دیکھ کر ان کو ترس آیا اور خاص ترکیبوں سے انھوں نے پھر ٹونک واپس کر دیا، مگر جی نہ لگا، اور دوسرے سال وطن سے بجائے ٹونک[1] کے اُس آخری قتل گاہ میں پہونچ گیا، جہاں میری شہادت مقدر تھی یعنی دیوبند پہونچ گیا، دیوبند جس لفظ کو سطحیت کے مرادف خیال کرتا تھا، اب حقیقت کے تلاش میں اسی دیوبند کی طرف

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

جاننے والے دیوبندی و خیرآبادی لاگ ڈانٹ سے واقف ہیں، سینہ پہ پتھر رکھ کر اس مدرسہ میں داخل ہوا، خدا جزائے خیر دے غزالی کو اسیر ابن سینا و باقر کو . . . . اس نے حضرت شیخ الہند کے حلقۂ حدیث میں پہونچا دیا، کچھ دن کشمکش میں گزرے، عجب کٹھن دن تھے۔ آخر میں جس کی غلامی کی سرفرازی نصیب ہوئی، تعجب سے سنئے گا کہ تین مہینہ تک اس کے مصافحہ سے کراہتاً یا احتقاراً محروم رہا، ایمان و یقین کے الفاظ سے آشنا تھا، لیکن حقیقت سے بیگانہ، حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس دولت کی سعادت میسر آئی۔ اب تک مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے

---

[1] ٹونک سے رخصت ہوتے ہوئے مولانا برکات احمد کے مدرسہ خلیلیہ کی دیواروں پہ کوئلہ سے یہ لکھ کر روانہ ہوا ہے

روزگارم بہ شد بہ نادانی　　من نہ کردم شما حذر بکنید

میری روانگی کے بعد کسی نے مولانا تک یہ بات پہونچا دی بہت خفا ہوئے ۱۲

متعلق سنا تھا کہ شعر و خطابت میں اچھے تھے، لیکن ٹوٹی پھوٹی سہارنپوری اُردو میں ان کے چند رسائل نظر سے گذرے، ایسا معلوم ہوا کہ اس زمانے میں جس علم کلام کی حاجت ہے حضرت پر اسی کا الہام ہوا ہے، زبان سے قطع نظر کر کے مطالعہ میں مصروف ہوا، اور اسلام کا ایک جدید نظام سامنے آگیا، مولانا کی کتابوں کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا بھی مجھ پر اچھا اثر پڑا، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں جو فلسفہ ان بزرگوں نے تیار کیا تھا، اس کا مذاق غالب ہوا، اسی مذاق کے سلسلہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی فتوحات پر بھی نظر پڑی، ایسا معلوم ہوا کہ میری کھوئی ہوئی چیزیں سب اسی میں ہیں، حالانکہ اس کتاب کے فقروں پر فقرے میرے لئے ناقابل فہم ہوتے تھے، مگر جی مطالعہ سے نہیں گھبراتا تھا اور خواہ اُن کی مُراد کچھ ہو، لیکن میری سمجھ میں اسلامی حقائق کے متعلق کوئی نہ کوئی بات ضرور آجاتی تھی اور میری عقلی سیر کی انتہا شیخ اکبر ہی کی کتابیں ہیں۔ مجھ پر فصوص کا اتنا اثر نہیں ہے جتنا فتوحات کا، اس کتاب کے مطالعہ میں ہر چیز کا سمجھنا میں نے کبھی مقصود نہیں رکھا، بلکہ جو سمجھ میں آجائے اسی کو مقصود قرار دیا۔ شیخ اکبر کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "عبقات" سے اس سلسلہ میں مجھے خاص دلچسپی رہی اور فائدہ پہونچا۔ شیخ اکبر کے متعلق یہ عجیب بات ہے کہ ان کے خاص موضوع بحث وحدت الوجود سے مجھے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ خیرآباد ڈی اسکول کے طالب علم ہونے کی

وجہ سے تقلیداً اس خیال کو اچھا سمجھتا تھا لیکن خواہ نخواہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا
تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ اندرونی طور پر میرے میلانات اس کے خلاف تھے، اگرچہ اب یہ
مسئلہ میرے لئے بدیہی ہے اور جو بجائے چند وجودوں مثلاً اہرمن و یزداں یا مادہ و روح
خدا کے عالم سر چشمہ ذات واحد کو جیتے ہیں اس کی ایک خاص تعبیر وحدت الوجود کو قرار
دیتا ہوں، شہود و وجود کے اختلافات کو لفظی اختلافات سمجھتا ہوں، بہر حال شیخ اکبر کا
معتقد اس مسئلہ کے سوا دوسرے دینی حقائق میں تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا جس
ماحول میں میں نے ہوش سنبھالا تھا اس میں مقلد و غیر مقلد کی بحث چھڑی ہوئی تھی، اس
لئے ایک ہلکا سا تعلق مجھے اسلامی فروع کے اس اختلاف سے بھی کچھ دن رہا، مگر
بہت جلد شیخ عبد الوہاب شعرانی کی کتابوں خصوصاً میزان الکبریٰ سے طبیعت سنبھل گئی
اور مفتی عبد اللطیف صاحب رحمانی کی کتاب تذکرۂ اعظم سے بھی خیالات میں اصولی
ترمیم میسر آئی، نیز دیوبند کے دورۂ حدیث خصوصاً شیخ الہند اور علامہ کشمیری کے درس کا
بھی اثر یہی ہوا کہ غیر متعصب حنفی ہو گیا، اور بحمد اللہ اس وقت تک یہی حال ہے۔ غیر متعصب
کا مطلب یہ ہے کہ شافعی، حنفی اختلافات میری نگاہوں میں چنداں وقیع نہیں ہیں، ہر
سلسلہ کے بزرگوں کا احترام دینی حیثیت سے کرتا ہوں اور خواہ مخواہ بلا ضرورت
فتنہ پردازی کے لئے عوام کے سامنے ان فروعی اختلافات کو چھیڑ کر تفریق بین المسلمین
جیسے کبیرہ کے ارتکاب کو مذہبی جرم خیال کرتا ہوں۔ مقلدیت غیر مقلدیت کے سوا اور
دوسرے عصری خیالات مثلاً نیچریت یا انکار حدیث والی قرآنیت یا انکار تصوف والی

دہابیت، ان چیزوں کا مجھ پر کبھی اثر اس لئے نہیں ہوا کہ چچا مرحوم کی صحبت ہی میں سارے سوالات سے واقف ہو چکا تھا، اس لئے مجھے صرف جواب سوچنا پڑتا تھا، بہتوں کو دیکھتا ہوں کہ یہ سوالات اچانک ان کے سامنے آتے ہیں، ایک مدت سوالات ہی میں بسر کرتے ہیں، پھر توفیق رفیق ہوتی ہے تو جواب تک ان کی رسائی ہوتی ہے۔ بحمد اللہ سوال کی منزل میری طے شدہ تھی۔ اس لئے جواب تک بآسانی رسائی ہوتی رہی۔

دیوبند میں میرا قیام کچھ دن تو طالب العلمی کی حیثیت سے رہا، اور کچھ دن مدرسہ کی ملازمت و خدمت میں گزرے کہ اچانک مقادیر نے مجھے حیدرآباد پہنچا دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن دانی کا شہرہ سن چکا تھا، خدا نے ان کی صحبت کی سعادت سے سرفراز فرمایا۔ اور قرآن کے چند جدید پہلو مجھ پر مولانا کی صحبت میں کھلے کہ اسی عرصہ میں حیدرآباد کے ایک وکیل، جو اب ناظم (جج) ہیں، اور مولانا محمد حسین اسم گرامی ہے، ان کی ملاقات میسر آئی، حضرت کے طفیل میں قرآن مجید کی آیتوں کے استعمال کی ایک نئی راہ معلوم ہوئی، بالآخر تھک تھکا کر اب جب کہ میری عمر انچاس کے قریب ہے، طلسم ہوشربا کی داستانوں سے شروع کر کے ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ کو اپنے مطالعہ کی آخری کتاب قرار دیئے ہوئے ہوں یوں چونکہ مولویت اور مدرسیت میرا پیشہ ہے اس لئے پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے کے لئے ہر قسم کی کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں، لیکن ذوق مطالعہ و مراقبہ کی تکمیل صرف اسی

کتاب سے ہورہی ہے، اور حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسا ہی پر خاتمہ ہو، غالباً اب اس کے اظہار میں شاید کچھ مضائقہ نہیں کہ اسی قرآنی ذوق میں بحمد اللہ قرآن پاک کا ایک بڑا حصہ بڑھاپے میں محفوظ ہو چکا ہے۔ خدا کرے کہ اسی مشغلہ میں عجیب و غریب تجربات والی یہ زندگی ختم ہو۔ ربنا انک تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ من شئ فی الارض ولا فی السماء انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ایک لطیفہ۔ کتابوں کے افادہ کے سلسلہ میں ایک بات دماغ سے کبھی نہیں نکلتی، بچپن میں جب انگریزی شروع کی اور انگریزی کے حروف تہجی کو پہچاننے لگا تو ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا، میرے ماسٹر صاحب کے پاس انگریزی کی کوئی موٹی سی کتاب تھی جسے وہ پڑھ رہے تھے، چھوڑ کر کسی ضرورت سے وہ گئے، میں نے کتاب اٹھالی اور دیکھنے لگا، چونکہ انگریزی کا ہر حرف دوسرے سے جدا ہوتا ہے اب جو میں نے دیکھا تو کتاب کے ہر ورق کی ہر سطر فر فر پڑھ رہا ہوں یعنی اس کے حروف پہچان رہا ہوں۔ میری مسرت کی اس دن انتہا نہ رہی کہ چند ہی دنوں میں انگریزی کی اتنی بڑی کتاب میری سمجھ میں آنے لگی۔ اگرچہ بہت جلد اپنی غلط فہمی معلوم ہو گئی، لیکن یہ ایسا مغالطہ ہے جو مجھے اکثر اب بھی اس لئے یاد آتا رہتا ہے کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی اس وقت مسرت حاصل ہو کہیں اس وقت بھی وہی مغالطہ نہ پیش آرہا ہو، کتابوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام حقائق کے متعلق مجھے کبھی کبھی اس قسم کا خواہ مخواہ خطرہ ہوتا ہے،

اور عہد طفلی کا یہ مغالطہ باعث عبرت بنا ہوا ہے۔ خیالات کی رَو میں ایک چیز بھول گیا۔ میری مراد ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم سے ہے ان دونوں مرحومین کے بعض خیالات نے میری ذہنی رفتار کی تصحیح میں مدد کی ہے اور ناشکری ہوتی اگر ان کا ذکر قصداً ترک کر دیتا۔ اسی طرح حضرت تھانوی مدظلہ العالی کے بعض اقوال نے بعض اسلامی حقائق کے سمجھنے میں میری بڑی رہنمائی کی ہے، جزاہم اللہ عنا خیر الجزاء۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کا بھی ممنون ہوں، سیرت طیبہ کے بعض اہم رُخ اُنھیں کے اشارے سے میرے سامنے آئے۔ ایک خاص نسبت جس کا اظہار مناسب نہیں ہے اس میں مولانا جامیؒ مرحوم کی غزل سرائیوں کو بڑا دخل ہے۔ قدس اللہ سرہٗ۔



ازجناب میاں شبیر احمد صاحب بی، اے آکسن مٹ پرہاوپن

یہ ایک بہت مشکل سوال ہے کہ کون سی کتابیں میری محسن ہیں ؟

کون سی کتاب ہے جو میں نے پڑھی اور جس کا احسان میرے سر پر نہیں۔ وہ بری ہو یا بھلی ہو لازم ہے کہ اُس نے مجھ پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑا ہوگا۔ پھر ایسی بھی بہت سی ہوں گی جنھیں یاد کرنے پر اُن کے اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن میں یہاں صرف دو چار کتابوں کا ذکر کروں گا جو اس عنوان کو دیکھ کر مجھے فوراً یاد آگئیں۔

وہ کتاب جس نے اوائل عمر میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا شبلی کی الفاروق تھی اسلام تاریخ کہانی سیاست، استبازی اس میں یہ سب کچھ تھا۔ گویا لڑکپن میں مجھے ایک رہنما مل گیا میں نے جانا بس یہی اسلام ہے۔ برسوں گزر گئے کئی مرتبہ الحاد نے کامیابی کے ساتھ میرے دماغ پر حملہ کیا لیکن دل جس الفاروقی رنگ میں پہلی عمر میں رنگا جا چکا تھا وہ رنگ کچھ نہ کچھ باقی رہا۔ ایک تو عمر ایسی تھی کہ جو اثر پڑا وہ سٹ نہ سکا اور دوسرے کتاب ہی ایسی عظیم الشان تھی کہ جب میرے ایک دہلوی ادیب دوست نے اس پر دو سال ہوئے نکتہ چینی کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مجھ پر ذاتی حملہ کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی پڑھنے کے بعد بھی میری پسند کی کتاب الفاروق ہی رہی۔ حضرت عمرؓ کا وہ صحرا میں اپنے غلام کو اونٹ پر بٹھا کر اُس کے آگے آگے چلنا۔ وہ راتوں کو گشت کرنا۔ وہ ایک بڑھیا کا دلیری سے کہنا اتق اللہ یا عمرؓ، اسلام کا وہ دو بڑی سلطنتوں پر چھا جانا ان کا اثر آج تک طبیعت سے زائل نہیں ہوا۔

پھر انگلستان سے واپس آکر مجھے خوب یاد ہے کہ جتنا لاادریت نے میرے دماغ پر قابو پایا اتنا ہی میرا یہ معمول ہوگیا کہ ہر روز صبح کو قرآن مجید (عربی میں) دس منٹ اور دیوان حافظ دس منٹ پڑھا کرتا ۔

کارلائل کی "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں "محمد" والا مقالہ مجھے بے حد پسند تھا، چنانچہ آکسفورڈ میں جب میں نے ایک تاریخی مقالہ لکھا اور اس میں کارلائل کے اس مقالے سے ایک اقتباس دیا تو میرے ایک انگریز پروفیسر کو وہ اتنا پسند آیا کہ اس نے کہا کسی طرح اسے اپنے آخری امتحان میں بھی درج کرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے کئی جملے مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

میری ایک عجیب عادت تھی کہ جو کتاب مجھے بہت پسند آتی اسے نا تمام چھوڑ دیتا۔ دیوان حافظ میں نے ایک ماہ میں آدھا پڑھا، اتنا پسند آیا کہ اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا، باقیماندہ دیوان کا اکثر حصہ میں نے آج تک نہیں پڑھا۔ میں نے بہت کم ناولیں پڑھی ہیں لیکن ڈاکٹر ہوگو کی مشہور ناول "لے مزرابل" (Les Miserables) مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے بارہا تھوڑا تھوڑا پڑھ کر چھوڑ دیا یہاں تک کہ شروع کرنے کے سترہ سال بعد اسے ختم کیا۔ میں اسے دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔

حال میں میں نے ایک کتاب "I Believe" (میرا عقیدہ) پڑھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی۔ اس میں دنیا کے چند بڑے مفکرین نے اپنے ذاتی عقیدے بیان کئے ہیں اکثر عقیدے لاادریت یا دہریت سے ملتے جلتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کا ایمان الحاد کے حملوں کے بعد قائم نہیں رہ سکتا تو وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں ۔

مولانا بدالدین صاحب علوی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میری والدۂ مرحومہ ایک دیندار علم دالی خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے تربیت کا سلیقہ
اُن کو ایسا عطا فرمایا تھا کہ باید وشاید۔ والد مرحوم کو تربیت اور تعلیم سے بچّوں کے
بڑے ہوجانے کے بعد بھی سروکار نہ تھا تمام امور کی ذمہ داری والدہ مرحومہ پر تھی۔
مروجہ طریقہ پر ابتدا مجھے کلام اللہ پڑھایا گیا پھر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابوں کا
سلسلہ شروع ہوا۔ سیرت نبوی اور تاریخ عرب سے دلچسپی والدہ مرحومہ پیدا کر چکی
تھیں اُردو پڑھنے کی لیاقت آتے ہی سیرت کی ایک بڑی ضخیم کتاب شمس التواریخ
ہاتھ لگی ایک کتب فروش اتفاق سے دروازہ پر یہ کتاب لے کر آیا والد مرحوم نے
میری طبیعت کی مناسبت سے خرید لی اور مجھے دی۔ جب وہ جلد بندھنے کے لئے گئی تو
مجھے خوب یاد ہے کہ کس بے چینی کے ساتھ میں اس کی واپسی کا منتظر رہا۔ میرے ایک
ہمسن چچا زاد بھائی اُن دنوں آئے ہوئے تھے تقاضے کے لئے بار بار وہ جلد ساز
کے پاس بھیجے جاتے۔ جب وہ آگئی تو میں تھا اور وہ۔ قرآن مجید کے درد اور سبق کے
بعد سارا وقت شمس التواریخ کے پڑھنے میں گزرتا اُس وقت نو دس سال سے زیادہ
عمر نہ تھی بیسوں باتیں سمجھ میں نہ آئیں لیکن کتاب کو نہ چھوڑتا بالآخر اس کو ختم کر ڈالا،
اب والدہ مرحومہ کو سُنانے کی ٹھہری غرض کسی نہ کسی بہانہ سے اس کے ساتھ شغف نسبت
اس کی محبت کا تقاضا تھی، برادر موصوف نے جو ایک معزز عہدہ پر فائز ہو کر اب
رحلت کر چکے ہیں میرا شغف دیکھ کر یہ معمول قرار دے لیا تھا کہ ہر خط میں عزیزوں کے

ساتھ شمس التواریخ کو بھی سلام لکھتے۔ اُس زمانہ میں امرتسر سے اخبار وکیل نکلتا تھا
والد مرحوم نے اس کو میرے نام پر جاری کرا لیا تھا۔ اس میں بلاد اسلامیہ کی خبروں سے
خاص دلچسپی تھا۔ ایک پرچہ میں شمس التواریخ کے حصہ دوم کا اشتہار نظر پڑا۔ عرض کرتے
ہی کتاب منگوا دی گئی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں تھی اور حصہ اول
کی ایک تہائی ضخامت رہی ہوگی۔ چند دنوں میں پڑھ لی۔ اب کچھ لکھنے کا شوق بھی
پیدا ہو چکا تھا تلاوت اور دور کے لئے جو نسخہ قرآن مجید کا میں نے خود پسند کرکے
منگوا دیا تھا اس میں شاہ عبد القادر صاحبؒ کا ترجمہ اور ابن عباسؓ کی تفسیر کا ترجمہ
حاشیہ پر چھپا ہوا تھا۔ پہلا شوق اس تفسیر کو بصورت کتاب علیحدہ نقل کر لینے کا ہوا
چنانچہ کچھ لکھ ڈالا پھر شمس التواریخ سے انتخاب کرکے ایک تاریخ عرب لکھنی شروع
کی۔ شمس التواریخ حصہ دوم کے ساتھ مولوی عبد الرحمٰن امرتسری کا سفر نامہ بلاد اسلامیہ
بھی آیا تھا اس میں قسطنطنیہ کا ذکر بڑی دلچسپی سے پڑھا اسی سے مولانا شبلی نعمانی کے
سفر نامہ کا شوق ہوا وہ منگوایا گیا۔ بہت دلچسپ معلوم ہوا اُسی زمانہ میں مجھ کو فارسی
اور انگریزی پڑھائی جا رہی تھی پڑھانے کا ذوق بھی اُسی وقت سے ہے جو لڑکے
ساتھ کھیلنے کو آتے ان کو نیچی جگہ بٹھا کر خود اونچی جگہ بیٹھتا اور جو خود پڑھا ہوتا
وہ ان کو پڑھاتا۔ انھیں دنوں ایک ملازم نے مجھ سے تواریخ حبیب الٰہ
پڑھی والدہ مرحومہ نے جو فارسی اور اس کے متعلقہ مضامین کی کتابیں نانا صاحب مرحوم
سے پڑھی تھیں ان میں قواعد کی ایک کتاب اصول عجیبہ تھی۔ یہ کتاب مجھے نہیں

پڑھائی گئی تھی مگر میں نے جب اس کو دیکھا تو بہت پسند آئی اور اپنے چھوٹے بھائی مرحوم کو وہ پڑھا کر اپنے نہ پڑھنے کی تلافی کر لی۔ فارسی کے بعد عربی شروع کرائی گئی اور **النحو** اور **البیان** (عربی اردو کا رسالہ) میرے نام پر جاری ہوئے اسی دوران میں مولانا شبلی نعمانی کی دیگر تصانیف بھی دلچسپی سے پڑھیں۔ شمس التواریخ حصہ سوم کا چھپنا شروع ہوا اور ماہ بماہ جس قدر چھپ جاتا آتا رہتا تا آنکہ کئی سال میں تکمیل کو پہونچ کر پوری کتاب حاصل ہوئی پھر حصۂ چہارم بھی اسی طرح پر حاصل کیا گیا مگر افسوس ہے کہ پہلا حصہ جو ایک زمانہ میں میرے لئے عزیز ترین تھا ضائع ہو گیا ایک مہربان مستعار لے گئے پھر واپس نہ دیا۔

عربی کی تعلیم شروع کرتے ہی عربی کے جملے بنانے کا شوق غالب ہوا۔ پڑھانے والے صاحب اگر گریز بھی کرتے تو میں نہ چھوڑتا۔ عربی کی مشق کے لئے ارشاد الطالب زیر استعمال رہتا۔ مولوی امجد علی صاحب بہاری کا الانتخاب الجدید بھی اُسی زمانہ میں ابتدائی مراحل کے لئے بہت نافع ہوا۔ اب بھی میں مبتدیوں کے لئے اس کو تجویز کیا کرتا ہوں۔ عربی بول چال مصنفہ عبدالرحمٰن امرتسری سے کچھ دنوں خود والد مرحوم نے مشق کرائی مگر یہ شوق کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ درس عربی کے متوسطات میں مشغول تھا اب استاذ العلماء کی خدمت میں باریابی ہوئی سب سے پہلی کتاب جو شروع کی میبذی تھی اس ذات بابرکات کی کفش برداری کا یہ فیض ہوا کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی فیض بخش اور محسن تھی۔ درس نظامی کی کتابوں کے نام گنوانا بیکار ہے۔

سب ایک ایک کر کے پڑھیں اور سب نے ایسا رنگ جمایا کہ کوئی دوسرا ذکر اچھا نہ لگتا۔ درس نظامی کے ساتھ ساتھ ادب کی کتابیں پڑھنا اور عربی تحریر کی مشق برابر جاری رہی اور بعض رسائل بھی عربی میں تالیف کئے :

انگریزی تعلیم کا سلسلہ عربی کے ساتھ کچھ عرصہ تک چلتا رہا۔ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کا انٹرنس کا امتحان دیا۔ کامیابی پر کالج میں داخلہ کا خیال تھا مگر خدا کو منظور تو کچھ اور ہی تھا نا کام رہا اور انگریزی یک لخت چھوٹ گئی تمام وقت عربی پر صرف ہونے لگا۔ بجز اس کے کہ کبھی کبھی والد مرحوم انگریزی املا کرادیا کرتے تھے بس دو کام تھے پڑھنا اور پڑھانا۔ اپنے پڑھنے سے فراغت پائی تو صرف پڑھانا رہ گیا ۱۹۲۱ء میں انٹرمیڈیٹ کالج میں عربی کا معلم مقرر ہوا اور چھوٹی ہوئی انگریزی سے پھر سابقہ پڑا، پہلے سال کورس کو اردو ترجمہ سے پڑھایا۔ لڑکوں نے انگریزی میں ترجمہ کی خواہش کی، اس سلسلے سے انگریزی زبان اور گرامر کا مطالعہ ناگزیر ہوا اور دوسرے سال ہی سے بذریعہ زبان انگریزی تعلیم دینا شروع کر دیا۔ انگریزی میں نکلسن کی لٹریری ہسٹری چارلس لائل کی عربین پوئٹری اور مقدمہ مفضلیات کلاوسٹن کی عربین پوئٹری اور ہوارٹ کی عربک لٹریچر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن سے فائدہ اُٹھایا۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ عربی تحریر کا سلسلہ ہمیشہ جاری تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج کے زمانہ میں عربی کے مضامین مصر و شام کے رسائل میں نکلا کئے۔ ذوق تحریر و تالیف نے ابن درید اور بشار پر کام کرنے کے لئے مستعد کر دیا، ان کاموں کا ایک حصہ (یعنی شرح المختار) مصر سے شائع ہوا۔ ان کاموں کے

سلسلہ سے عربی لٹریچر کی تمام کتابیں جو دستیاب ہوئیں چھان ماریں۔ میرے مکرم دوست مولانا عبدالعزیز میمن کا چھوٹا کتب خانہ مگر نوادر کا مجموعہ اُن کی عنایت سے استعمال میں رہا اور بہر کتاب محسن بنی۔ ان کتابوں کی فہرست جزء ثانی شرح المختار میں شائع ہو چکی ہے محسن کتابوں کی فہرست میں تفسیر خازن، حاشیہ جمل، حدیث میں فتح الباری اور عمدۃ القاری اللمعات، مرقاۃ المفاتیح، رجال میں تہذیب التہذیب، فقہ میں فتح القدیر، عینی عنایہ، لغت میں قاموس، نظم میں مشاہیر شعراء کے دواوین، نثر میں قالی کی امالی اور الکامل متعلقات تصوف میں اخبار الاخیار اور اصول المقصود وغیرہا کا نام خصوصیت سے لینا ضروری ہے۔



از مولانا سید طلحہ صاحب ایم اے پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور

مولانا کا یہ ایک ذاتی خط کی شکل میں ہے جس میں موصوف نے مولانا ابوالحسن علی صاحب کو مخاطب کیا ہے، اس مضمون سے ایک فاضل استاد کا نقطۂ نظر، اس کے ذہنی تاثرات اور تعلیمی تجربات معلوم ہوتے ہیں جو اہل علم اور بالخصوص حضرات مدرسین کے لئے خاص طور پر دلچسپ اور مفید ہوں گے۔

عربیت اور اُس کے متعلقات ابتدائی تعلیم جیسا کہ عموماً قاعدہ ہے بزرگوں کے جبر و قہر کے ماتحت رہی سب سے اول شوق و ذوق سے جو کتاب پڑھی وہ مقامات حریری تھی اس کا اسلوب قافیہ بندی اور سجع نہایت مرغوب تھا انشا نویسی بھی اسی طرز کی پسند آئی۔ یہ اثر مدتوں قائم رہا۔ بعد میں جاحظ کی انشا اور تیسری صدی کی عام کتب تاریخ پسند آئیں۔ اغانی الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ کے سیاسی خطوط اور نہج البلاغہ نے نہایت متاثر کیا نظم میں معلقات، حماسہ، قصائد متنبی پسند آئے لیکن مضمون آفرینی کی نسبت شوکت الفاظ جزالت اسلوب زیادہ پسند آئی آج کل عربی نثر خصوصاً بعض مصری جرائد کے مقالات افتتاحیہ دل کو بہت بھائے۔

صرف و نحو صرف میں شافیہ اور رضی اچھی معلوم ہوئیں۔ ان کتابوں کا ذوق ایک زمانہ میں اتنا تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے تفریح طبع کے لیے کبھی کبھی شافیہ سامنے رکھی ہوتی۔ نحو میں مفصل اور اوضح المسالک اور مغنی اللبیب منتخب کتابیں ہیں سب سے گہرا نقش سیبویہ کی الکتاب کا ہے جو دماغ پر اب بھی ثبت ہے۔ بعض لوگوں کو شاید گراں

گزرے کافیہ اور شرح جامی نے کبھی کوئی اثر نہ پیدا کیا۔ اس کو چاہے ہماری کم لیاقتی سمجھو۔ متعلقات لغت اور عربیت میں المزہر للسیوطی بہت پسند آئی۔ ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین عربی اشعار کا مجموعہ ہے یہ اور کامل للمبرد جو عربیت کا خزانہ ہے مجھے بہت پسند ہیں۔

علم حدیث دل چاہتا ہے کہ اس موضوع پر صفحہ کا صفحہ رنگ ڈالوں لیکن ڈر یہ کہ تم اور تمھارے قارئین اکتا جائیں گے عربیت کے شوق سے حدیث کے شوق کو ترقی ہوئی سب سے بڑھ کر ماحول اور خاندانی روایات معاون تھیں بھلا حضرت سید عرفان مرحوم اور حضرت سید مصطفٰے مرحوم[1] جس ماحول میں ہوں وہاں حدیث کا شوق کیونکر نہ ہوگا سب سے زائد محبوب اور مرغوب کتاب امام بخاری کی جامع صحیح ہے جس کی محبت اور شیفتگی عشق کے درجہ کو پہونچ گئی۔ اس کتاب کی محبت کے لئے میں الفاظ نہیں پاتا تھیں یاد ہوگا کبھی کبھی بے اختیاری میں تمھارے سامنے اس کی کسی حدیث کی اسنادہی پڑھنے لگتا اور کبھی ترجمۃ الباب اور قال الحسن قال ابن سیرین قال فلاں زبان سے شوق میں نکلتا اس کتاب کی عظمت اور محبت پیدا کرنے میں میرے فاضل استاد مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر کابل کو بڑا دخل ہے اس کتاب کے پڑھنے کے زمانہ میں فتح الباری سے تعارف ہوا شدہ شدہ اسماء الرجال کا

---

[1] مولانا سید عرفان اور مولانا سید مصطفٰے حضرت سید احمد شہیدؒ کے نواسے اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر علماء میں تھے اتباع نبوی تورع اور تقوی اور کتاب و سنت کے شغف اور عمل میں وہ دور اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے ۱۲

شوق اور صحابہ اور طبقات صحابہ کے حالات کی جستجو ہوئی۔ اکثر خیال ہوتا کہ صحابہ کے حالات اس قدر معلوم ہوں کہ گویا ان کو دیکھا ہے کس صحابی کا کس سے کیا رشتہ ہے آنحضرتؐ سے کیا تعلق تھا اور اسی قسم کی دوسری جزئیات معلوم کرنے کا شوق تھا۔

پھر اسی طرح تابعین کے حالات پھر دیگر ائمہ و اکابر اور رواۃ حدیث کے حالات کا شوق اور ان کی وفیات اور عمریں یاد رکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ طالب علمی ہی میں مسند دارمی اور پوری مسند ابن حنبلؒ دیکھی، مؤطا امام مالکؒ نے بھی خوب متاثر کیا، ان کتب حدیث اور مصنفین کے دماغ پر جو مخلوط اثرات پڑے ان کا اگر تجزیہ اور وضاحت کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں کہ امام مالکؒ کی عظمت اور ان کی مؤطا کی محبت بھی ہے اور امام بخاری کی ذات کے مقابلہ میں صحیح بخاری سے زیادہ تعلق اور گرویدگی ہے لیکن مسند احمد بن حنبل کے مقابلہ میں احمد بن حنبل کی ذات سے زیادہ محبت اور تعلق معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ نہیں بتلا سکتا۔

افسوس صحیح مسلم کا کوئی اثر دماغ پر نہیں رہا، یوں حدیث کی تقریباً سب کتابیں اساتذہ سے پڑھیں، میرے تمام تر اساتذہ حنفی تھے اور میں حنفیت کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ ان کی شاگردی نے ایک قسم کا اعتدال پیدا کر دیا، ورنہ میں سخت جامد غیر مقلد ہوتا۔ زاد المعاد بظاہر سیرت کی کتاب ہے۔ لیکن میرے نزدیک حدیث کے اہم مسائل کا ایک مختصر کتب خانہ ہے۔

قرآن و تفسیر | تم تفسیر کے معلم ہو، قرآن و تفسیر کے متعلق سننا چاہتے ہوگے۔ بھائی

بناوٹ سے کچھ لکھ دینا یہ نازیبا ہے باعتبار عربیت کے قرآن کے اسلوب اور جزالت کا اثر اس وقت سے قائم ہوا جب عربیت کی ایک حد تک تحصیل کر لی اور اسی بات نے حفظ کا شوق دلایا معانی بیان کی درسی کتابوں سے یہ اثر اور گہرا ہوا اور قرآن پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی احکام فقہیہ یا دیگر مسائل کا استنباط۔ دوسرے عربیت کے نکات، اور لغوی مسائل چنانچہ الاکلیل فی استنباط التنزیل للسیوطی اور تفسیر احمدی بہت پسند تھی۔ ابوبکر ابن العربی اور جصاص کی احکام القرآن اس وقت تک مجھے نہیں ملی تھی۔ استنباط مسائل کا اس قدر شوق تھا کہ آیۃ مادمت علیہ قائما سے دیوانی کے قیدی کا محبوس کرنا استنباط کیا اور پھر کتاب سے اس کی تائید ہوئی کبھی استدارہ ارض کی دلیل ڈھونڈھی غرض یہ سب اعتدالیاں سمجھو یا حول اور نصاب کا اثر بہرحال عرصہ تک یہ شوق رہا قرآن کے محاسن لفظی کے سلسلہ میں کشاف پوری مطالعہ کی اسی سلسلہ میں مفتاح العلوم للسکاکی، الطراز اور دلائل الاعجاز مطالعہ کیں بعض چیزوں کی تحقیق میں تفسیر کبیر کی طرف بھی رجوع کرتا عجیب بات ہے کہ قصص بنی اسرائیل اور حضرت داؤد وغیرہ کے قصہ کا اشکال کبھی محسوس نہیں ہوا، قصہ غرانیق، قصہ صواع الملک کی تحقیق کا شوق بھی کبھی نہیں ہوا نہ ربط آیات اور قسم اور جواب قسم کے متعلق کے مسائل سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوئی، قرآن سے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ کتاب عزیز جلیل القدر کتاب آسمانی صحیفہ ربانی علوم و معارف کا گنجینہ ہے جو ابدالآباد تک سیرابی کے لئے کافی ہے۔ خشیت الٰہی، ایمان

بالآخرت، ایمان بالقیامت، جس قدر اس کی تلاوت سے پیدا ہوسکتا ہے دنیا کی کسی تحریر و تقریر اور کسی انشار سے نہیں ہو سکتا لیکن اس دنیائے ناپائدار کی جو مزرعۃ الآخرہ ہے تفاصیل انسان ضعیف البنیان کی سمجھ میں اس کتاب سے نہیں آسکتیں یہ کمزوری انسان کی ہے نہ کہ کتاب عزیز کی مثال کے لئے ایک آیت پیش کرتا ہوں وعاشروھن بالمعروف ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف کیا انسان اس سے وہ تمام تر تفصیلات و تعلقات زناشوئی سمجھ سکتا ہے جو کسی حدیث کی کتاب کی تفصیلات سے سمجھ سکے گا جناٹیل[1] ان تفصیلات کو تقدس کے دامن پر دھبہ سمجھتے ہیں جن کی ساری عمر خباثت اور خبیثات کے ذکر میں گزر گئی ہے اسی مسئلہ پر عبادات' آداب طعام و آداب شرب کو قیاس کر لو۔ ایک اور نظریہ قرآن کے متعلق ہے اور وہ پہلے کی تفصیل ہے وہ یہ کہ بغیر احادیث کی روشنی کے کوئی نو مسلم راسخ الایمان محض قرآن کو عقیدت سے پڑھے تو دنیا کی کسی چیز میں اس کو لطف نہ آئے گا۔ اور وہ محض آخرت کا آدمی ہو جائے گا یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے یہ اعتدال حدیث سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے آنحضرتؐ کی ذات اور آپ کا اسوہ ہے جنھوں نے قرآن پر عمل کرنے کا صحیح ترین اور عملی نمونہ پیش کیا اس عملی تفسیر کو الگ کر کے آدمی اس بے اعتدالی سے بچ نہیں سکتا۔

علم تصوف احیاء العلوم اور مثنوی مولانا روم خود دیکھیں اور پسند آئیں، تمھارے والد ماجد مرحوم[2] (ہائے کیا آدمی تھے ان کی کون کون سی باتیں یاد کروں) اُن کے

---

[1] جنٹلمین کی جمع اور مولانا کی مخصوص اصطلاح ہے" [2] مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم سابق ناظم "ندوۃ العلماء"

مشورہ سے رسالہ قشیریہ عوارف للسہروردی اور فتوح الغیب کا مطالعہ کیا فتوح الغیب نے اس قدر دل و دماغ پر اثر کیا تھا کہ کسی انسان کی تصنیف نے وہ اثر نہ کیا ہوگا۔ حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کا اثر انتہا درجہ کا ہوا اور وہ یہ کہ تصوف کے مقابلہ میں شریعت کی تعظیم دل پر نقش ہوگئی اور یہ اسی کتاب کا فیض ہے' مثنوی اس لئے بھی پسند آئی کہ علم کلام اور تصوف کے مسائل نہایت خوش اسلوبی سے خلط کیے ہیں غزالی کی تصنیفات اکثر پسند آئیں فصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ خاصی اچھی معلوم ہوئی شیخ اکبر کی فتوحات کبھی طائرانہ نظر سے دیکھی کبھی کوئی نکتہ پسند آیا لیکن نہ اس کتاب کا شوق نہ اس سے بدشوقی کا افسوس ہے۔

معقولات اور علم کلام تمھیں تعجب ہوگا کہ ایام خواندگی میں جس قدر شوق سے دو کتابیں پڑھیں کوئی کتاب نہ پڑھی ایک بخاری دوسری حمد اللہ' میں مجبوراً یہ لکھ رہا ہوں صدرا کی بحث جزء لایتجزی بھی شوق سے پڑھی شرح مواقف کا طرز پسندیدہ ہے شمس بازغہ بھی پسند آتی ہے۔

اصول فقہ اور فقہ فقہ حنبلی کی کتاب المغنی نہایت پسند ہے لیکن مطالعہ میں نہیں رہی، فقہ حنفی میں ہدایہ کو ایسی کتاب سمجھتا ہوں کہ آدمی کو اہل عراق کی فقہ سے اس کے ذریعہ سے کامل مناسبت پیدا ہو جاتی ہے' اصول فقہ میں تحریر ابن الہمام اور توضیح و تلویح مجھے پسند ہے' اجماع کی بحث جیسی تم توضیح میں دیکھو گے کہیں اور نہ ملے گی، ہاں ایک بات لکھتا ہوں وہ میرا نظریہ بلکہ عقیدہ ہے' غالباً شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے

بھی کہیں اشارہ کیا ہے اصول فقہ مجتہد فیہ فقہی مسائل کی ایک توجیہ ہے جیسے نکات
بعد الوقوع ہوتے ہیں اس کے باوجود اس فن سے مجھے طبعی ذوق ہے۔

امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات شیخ الاسلام کی کتابوں میں سب سے
پہلی کتاب ان کے فتاوے دیکھے اس کا نہایت اچھا اثر پڑا اور ان سے انتہائی عقیدت
پیدا ہو گئی پھر تو ہر کتاب ان کی پسند آئی اور معلوم ہوا کہ متاخرین میں سے اگر کسی نے
پرانے اسلام کی طرف دعوت دی تو وہ یہ دونوں بزرگ ہیں۔ شیخ الاسلام کی
کتابوں میں مضامین کی ترتیب و تہذیب (عربی معنی میں) نہیں ہے ان کی پُر از مصائب
زندگی کا یہی مقتضیٰ تھا الغرض نہایت درجہ عقیدت ان صاحبوں سے ہوئی لیکن خدا
کا شکر ہے کہ بعض مسائل میں ان کی ہم آہنگی نہ کی مثلاً طلاق ثلاث فی مجلس واحد، یا
عصمت انبیاء کے متعلق ان کی رائے سے اختلاف ہے، حافظ ابن قیمؒ کی تصانیف میں
سے زاد المعاد خاص طور سے قابل ذکر ہے، میں لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک وہ
احادیث کا بہترین مختصر کتب خانہ ہے۔ تم کو تعجب ہوگا مولانا سید عرفان رحمۃ اللہ علیہ
(میرے رشتے کے ماموں اور حضرت سید شہیدؒ کے حقیقی نواسہ) کبھی کبھی تشریف لا کر
زاد المعاد جو ہمارے یہاں تھی مانگ کر دیکھنے لے جاتے ان کے بعد میں دیکھتا تو نہ
لطف آتا نہ قدر معلوم ہوتی آج میں اس کی قدر سمجھتا ہوں، حافظ ابن قیمؒ کی شفاء العلیل
بھی مجھے بہت پسند آئی نہایت عمدہ کتاب ہے اس میں قضا و قدر کے مسائل ہیں
ضمناً خیر و شر پر خوب بحث ہے۔

شعر فہمی | اس عنوان سے تم کو تعجب ہوگا میرا عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ رائج الوقت نصاب، درس سے یہ ذوق لطیف نہیں پیدا ہوتا ہے اس کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں، لوگوں کو کہتے سُنا کرتا تھا کہ مولوی شعر کیا جانیں" شعر من مدرسہ کہ برد" مشہور بات ہے نصاب درس کے اس نقص کی تلافی کتب ذیل سے کی اور انھوں نے مجھے فائدہ پہونچایا۔

آب حیات، تذکرہ گلشن بے خار، گل رعنا، مقدمہ دیوان حالی، شعر العجم سب سے زیادہ فائدہ موخر الذکر نے پہونچایا۔ واقعی یہ کتاب مجتہدانہ طرز کی ہے، مصنف کے مخالف بھی اس کتاب کے معترف ہیں۔ گل رعنا کے نام پر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جس کو سُنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا میں لاہور سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا تھارے والد مرحوم اور میں دوپہر کے وقت تمہارے موجودہ لکھنؤ کے گھر کے مشرقی شمالی کمرہ میں سونے کے لئے لیٹے تھے مرحوم فرماتے ہیں کہ ہم نے ہلکا کام سمجھ کر ان دو مہینوں میں ایک کام کیا ہے اور شعرائے اُردو کا تذکرہ گل رعنا کے نام سے مرتب کرلیا ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ مرزا صاحب کا کلام جہاں تک مل سکا ہے جمع کردیا ہے، ایک مصنف خود اپنی تصنیف اور ریسرچ ورک سُنا رہا ہے لیکن ہم دوپہر کے سونے کے بیمار بدمذاقی سے نیند کو ترجیح دے رہے ہیں اور یہ نہیں معلوم کہ یکایک اس مخلص بزرگ کے انتقال کی خبر پہونچے گی۔

مخلطات | مندرجۂ ذیل کتابوں میں سے ہر ایک مستقل کتب خانہ اور معلومات کا

خزانہ ہے۔ زادالمعاد، حجۃ اللہ اور مقدمہ ابن خلدون۔ آخر میں ایک بات لکھ کر ختم کرتا ہوں طالب علم کے لئے جب کچھ استعداد ہو جائے ایک مجموعۂ کتب ضرور اس کی مرضی پر چھوڑا جائے لیکن کبھی کبھی مشورہ بھی دیا جائے اس بات نے تم کو بھی فائدہ پہونچایا ہے اور مجھے بھی لیکن تمھارا مکتبہ ایک صدی سے اوپر زمانہ کا مجموعہ تھا اور علمار کا جمع کیا ہوا میرے یہاں کا مجموعہ محض نستعلیقی اور خوش سلیقگی کی تکمیل کے لئے جمع ہوا تھا۔



جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے مدیر برہان

میری اُردو اور فارسی کی پوری اور پھر عربی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم آگرہ میں گھر پر ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب قبلہ (اللہ اُن کی عمر دراز تر کرے) آگرہ کے نامی گرامی سرکاری ڈاکٹر ہونے کے باوجود انتہا درجہ کے مذہبی اور دین دار بزرگ تھے۔ اور وہ تعلیم سے زیادہ تربیت کو مقدم سمجھتے تھے۔ انھوں نے میری عربی تعلیم کے لئے دیوبند سے ایک عالم کو معقول مشاہرہ پر بلالیا تھا، جو ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے۔ اور تعلیم کے علاوہ اکثر بزرگان دین کی حکایتیں اور تاریخ اسلام کے مؤثر واقعات سُناتے تھے۔ شام کے وقت ایک ماسٹر صاحب انگریزی اور حساب وغیرہ پڑھانے آتے تھے۔ یہ سلسلہ تین سال تک قائم رہا۔ اس وقت تک اگرچہ مذہبی اعتبار سے میں نیک اور اسلامی عقائد کا پابند تھا، لیکن کوئی خاص علمی ذوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اکثر احباب کے اصرار پر ۱۹۲۲ء میں جب کہ میں پندرہ سال کا تھا، ابا نے بڑے اہتمام و انتظام سے مجھ کو دیوبند کے مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ یہاں آکر میں درسی کتابیں تو پڑھتا ہی تھا، لیکن مجھ کو خود بخود عربی ادب کا شوق پیدا ہوگیا، اور خارج اوقات میں میں مصر کے جرائد و رسائل، اور عربی ادب کی قدیم و جدید کتابیں بکثرت پڑھتا تھا۔ ابا میرے ماہانہ اخراجات کے لئے کافی روپے بھیجتے تھے، اس لئے مجھ کو اپنے اس شوق کی تکمیل میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس سلسلہ میں کامل للمبرد، اغانی، نہایۃ الارب، صبح الاعشیٰ یہ سب کتابیں دیکھیں اور پڑھیں، لیکن

البیان والتبیین للجاحظ نے مجھ پر سحر کا کام کیا، اس کی ایک ایک فصل کئی کئی بار پڑھتا تھا اور ہر مرتبہ نیا حظ لیتا تھا۔ نظم میں کتاب الحماسہ سے مجھ کو بڑی محبت تھی، اس کے سیکڑوں اشعار نوکِ زبان ہوگئے تھے۔ درسیات میں منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر، ہیئت، تاریخ، معانی و بیان اور عروض وغیرہ سب کچھ پڑھا، لیکن ادبی ذوق کی وجہ سے معانی و بیان پر جتنا وقت صرف کرتا تھا کسی اور علم پر نہ کرتا تھا۔ فلسفہ اور منطق کے اسباق میں بادلِ ناخواستہ شرکت کرتا تھا لیکن جب امام غزالیؒ کی مقاصد الفلاسفہ اور پھر تہافۃ الفلاسفہ میں نے خود مطالعہ کی تو فلسفہ میں بھی لطف آنے لگا، اور اس ذوق نے یہاں تک ترقی کی کہ ابن سینا کی اشارات امام رازی اور محقق طوسی کی شرحوں سے حل کی اور اس کو اول سے آخر تک خود ہی پڑھا۔

عربی نظم میں درسی کتابوں کے علاوہ ابو العلا معری کا سقط الزند اور لزوم ما لایلزم اور دیوان حسانؓ بن ثابت کا میں بہت گرویدہ تھا۔ اکثر یہ کتابیں میرے ساتھ رہتی تھیں، لیکن یہ میرا شوق و ذوق محض طالب علمانہ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعد میں جو میرا سنجیدہ ذوقِ علمی تعمیر ہوا اس میں مولانا شبلی مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض کتابوں کو بھی بڑی حد تک دخل ہے۔ میں اردو کے ادبی رسالے، افسانے اور ناول پڑھتا ہی تھا، مولانا ابو الکلام کے الہلال کی بھی جلدیں پڑھیں۔ اور ان کا تذکرہ اور مسئلۂ خلافت بھی پڑھا، اور بعض مضامین کئی کئی دفعہ پڑھے۔ لیکن یہ اثر عارضی تھا، وہ ایک برس کے بعد اتر گیا۔ مولانا شبلی کی کتابوں میں سب سے پہلے غالباً

میں نے المامون الغزالی پڑھیں۔ مولانا کے اندازِ نگارش، طرزِ تحقیق اور طریقۂ بحث نے دل پر عجیب اثر کیا۔ اور میں مولانا کی تحریروں کا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ میں نے آپ کی سب کتابیں خریدیں، اور پڑھیں۔ الفاروق اور سیرت النبیؐ جلد اول کئی بار پڑھیں اور ان دونوں کے مقدمے تو خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھے ہیں۔ ٹھیک یاد بھی نہیں، اسی تقریب سے ارض القرآن کی دونوں جلدیں اور سیرت عائشہؓ وامام مالکؒ زیر مطالعہ کیں اور دل پر مولانا سید سلیمان ندوی کی کاوش و محنت، جمع و ترتیب واقعات کا حسن سلیقہ اور ان کے شبلوی اندازِ تحریر نے بھی دل پر گہرا اثر کیا۔ اب میں رسالہ معارف کا خریدار بھی بن گیا، اور بجائے محض ادبی رسالوں کے سنجیدہ اور ٹھوس پڑھنے لگا۔ معارف خود خریدتا اور جامعہ، آئندہ اور زمانہ مانگے تانگے کا پڑھتا تھا۔ اب طبیعت ادب لطیف اور لسانی و لفاظی کے بجائے سنجیدہ علمی حقائق کی جویا ہو گئی تھی اُس زمانہ میں معارف کے سب مضامین سمجھتا نہیں تھا، لیکن یہ جانتا تھا کہ جب معارف میں چھپا ہے تو یقیناً بلند معیار کا ہوگا، اور مضمون نگار نے اُس کے لکھنے میں کوشش کی ہوگی اِس لئے دل میں قدر اُن نہ سمجھے ہوئے مضامین کی بھی ہوتی تھی۔ معارف کا ایک ایک پرچہ محفوظ رکھتا تھا اور جلد کے ختم پر اُسے مجلد کرا لیتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں تمام علوم و فنون درسیہ سے فارغ ہونے کے بعد مجھ کو حضرت مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم سے بسلسلۂ دورۂ حدیث بخاری اور ترمذی کا درس لینے کا شرف حاصل ہوا حضرت شاہ صاحب کا درس کیا تھا، علوم و فنون کا بحرِ زخار تھا جو شروع سے

آخر تک پوری تیزی سے موجزن رہتا تھا حضرت شاہ صاحب اپنی تقریر میں کثرت سے نامور مصنفین وائمۂ اسلام کے حالات، اُن کے علمی وعملی کارنامے، اجتہادات اور اُن پر تنقید وغیرہ بیان فرماتے رہتے، خصوصاً علامہ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہؒ حافظ ابن قیم، حافظ ابن حجر وغیرہم کا ذکر تو بہت ہی رہتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی ان تقریروں سے ہی مجھ کو حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی کتابوں کا شوق ہوا' اور میں نے ان دونوں اماموں کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور کچھ نہیں آئیں۔ بہرحال پڑھیں سب۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیفات نے جس سنجیدہ علمی ذوق کی طرح ڈال دی تھی حضرت شاہ صاحب کے درس نے اُس میں پختگی پیدا کردی۔ درس کے علاوہ میں یوں بھی حضرت کی پرائیوٹ مجلس میں شریک ہوتا رہتا تھا۔ آپ کی عام گفتگو بھی درس سے کم نہیں ہوتی تھی، میں اُس سے استفادہ کرتا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے۔ ابا نے انگریزی اور عربی دونوں ساتھ شروع کرائی تھیں لیکن دیوبند پہونچ کر انگریزی کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا، اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد خیال آیا کہ لاؤ انگریزی کی بھی تکمیل کرلوں بعض امتحانات پرائیوٹ اور بعض کالج میں داخل ہوکر دیے۔ سب میں سکنڈ کلاس کے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ آخر میں ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ رہا۔ بی اے میں میرے استاد آگرہ یونیورسٹی کے ایک بنگالی پروفیسر تھے' وہ انگریزی کے بڑے اچھے ادیب تھے انھوں نے مجھ میں بھی انگریزی لٹریچر کا شوق پیدا کردیا۔ میں نے اس

سلسلہ میں زیادہ تر ادبی کتابیں پڑھیں۔ برک کا انقلاب فرانس، مکالے کے مقالات اور تاریخ ہند اور سیاسیات پر بھی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کئی بار مطالعہ کی اور اب تک اپنے دل میں اس کی وقعت پاتا ہوں۔

فارسی میں میرا مطالعہ شعراء کے دواوین اور چند تاریخی کتابوں تک محدود ہے، دواوین میں میں نے عراقی، خسرو، نظامی، جامی، نظیری، عرفی، خاقانی وغیرہم سب کو پڑھا ہے، لیکن دیوان حافظ اور دیوان غالب مجھ کو سب سے زیادہ عزیز ہیں، اور خصوصاً دیوان حافظ کو تو میں اپنا مونس تنہائی، شریک رنج و راحت اور پریشانی میں ہمدرد و غمگسار سمجھتا ہوں۔ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ دل پر کسی وجہ سے سخت اضطراب و پریشانی کی کیفیت طاری ہے، اسی حالت میں دیوان حافظ پڑھنے لگتا ہوں، دو ایک غزلوں کے بعد ہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی اضطراب تھا ہی نہیں۔ ایک مرتبہ تو لسان الغیب نے پیر و مرشد ہی کا کام کیا، اللہ تعالیٰ ستار عیوب ہے اس لیے تفصیل سے بتلانے کی ضرورت نہیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ میں ایک مرتبہ سخت فتنہ میں مبتلا ہوگیا تھا، اگر حضرت لسان الغیب ایک شعر کے ذریعہ میری رہنمائی نہ فرماتے تو میں ارتکاب معصیت کے علاوہ شدید جانی و مالی نقصان سے دوچار ہوجاتا۔ بلبل شیراز کا یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا اور اسی وجہ سے میں ان کا دیوان حد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کئی دفعہ دیوان سے فال بھی نکالی ہے اور وہ صحیح ثابت ہوئی ہے۔

آخر میں عرض یہ کرنا ہے کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا پڑھا یا اب جو کچھ لکھتا پڑھتا ہوں وہ میرے نزدیک فیض و برکت ہے میرے والد صاحب قبلہ کے حُسن نیت و عمل کا، جنھوں نے عربی تعلیم کو بُرا سمجھنے والے لوگوں کی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود محض خالصۃً لوجہ اللہ مجھ کو عربی تعلیم دلائی اور اس پر اتنا ہی خرچ کیا جتنا کہ کوئی مالدار اپنے اولاد کی انگریزی تعلیم پر خرچ کر سکتا ہے، اور یہ سب صدقہ ہے میری والدۂ محترمہ کی دعاؤں کا جنھوں نے تہجد کی نمازوں میں میرے حُسن علم و عمل کے لیے بارگاہ ایزدی میں رو رو کر التجائیں کی ہیں اور کبھی انھوں نے یہ خواہش نہیں کی کہ دنیوی عتبات سے مجھے کوئی جاہ و منصب ملے اللہ دونوں کی عمر دراز کرے اور مجھ کو اُن کی تمناؤں کے مطابق حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔



از جناب پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے سابق وزیر تعلیم ریاست جونا گڑھ

ایک وقت تھا جب علامہ شبلی مرحوم کے الندوہ میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ مولانا تو اب فردوس نشیں ہیں، لیکن الندوہ فیض سلیمانی سے مرکر جی اُٹھا ہے۔ البتہ میری حالت یہ ہے۔ "اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند"

پھر بھی عزیزی ابوالحسن علی کا اصرار ہے اور مجھے خاطر عزیز منظور ہے اس لئے یہ چند سطریں تحریر ہیں۔

(۱)

بچپن میں جب سے مکتب میں بٹھا یا گیا اُس وقت سے اب تک جب کہ عمر رواں کے ۸۴ مرحلے طے کر چکا ہوں طالب علم ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ

"معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

خیر اگرچہ فلسفیانہ رنگ میں کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن میری دعا یہی رہی اور رہے گی "ربِّ زدنی علمًا" میرے والد ماجد میر فرخند علی صاحب قبلہ وکیل مرحوم تہجد گزار تھے اور نماز فجر کے بعد تلاوت کلام اللہ کے عادی تھے۔ میری عمر قریب گیارہ برس کے تھی، جب وہ آخر مرتبہ حیدر آباد تشریف لے گئے، چلتے وقت کلام مجید کا ایک نسخہ دیا جو ۱۲۷۶ھ کا چھپا ہوا تھا، مطبع نظامی کی مہر تصحیح لگی ہوئی، متن کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ اُردو۔ یہ نسخہ اُس وقت شائع ہوا تھا جب سُنا ہے کہ مطبع میں کام کرنے والے باوضو اور احتیاط سے کلام مجید چھاپتے تھے۔ جناب

قبلہ نے نسخہ دے کر فرمایا کہ روزانہ تلاوت کرتے رہنا اور ترجمہ بھی پڑھا کرنا، کچھ عرصہ تک میں محض تعمیل ارشاد کرتا رہا، لیکن پھر شوق پیدا ہوگیا، اور اب تک شاید ہی کسی دن تلاوت میں ناغہ ہوا ہو نسخہ اگرچہ اب بہت بوسیدہ ہوگیا ہے اور باوجودیکہ عمدہ چھپے ہوئے نسخوں کی اب کمی نہیں ہے لیکن اسی کہنہ نسخہ کو سینہ سے لگائے رہتا ہوں، اس کے صفحوں پر کہیں کہیں کچھ مٹے ہوئے دھبے بھی نظر آتے ہیں جو اس عمر رفتہ کی یادگار ہیں جب قلب میں اس قدر قساوت نہ تھی۔ میری زندگی میں گوناگوں انقلاب ہوئے متعلم سے معلم بنا اور مصنف کی حیثیت سے نشانہ ملامت بھی، لیکن خواہ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو یہی یقین ہے کہ

"ہرچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم"

میری پہلی محسن کتاب کتاب اللہ ہے اسی سے مجھے ہدایت نصیب ہوئی۔ اور یہی دونوں جہان میں میرے لیے نورٌ علیٰ نور ہے۔

(۲)

میری تعلیم مکتب سے شروع ہوئی اور تھوڑے عرصہ کے بعد انگریزی سکول اُناؤ میں داخل کردیا گیا، لیکن مدرسہ کے ساتھ مکتب کی پرانی تعلیم ساتھ ساتھ چودہ برس کی عمر تک جاری رہی۔

اسکول میں مولوی ظہور احمد صاحب لاہرپوری مرحوم فارسی کے پروفیسر تھے بڑے متقی اور پرہیزگار اور امام حجۃ الاسلام غزالیؒ کی تعلیمات کے شیدا، فارسی کورس

پڑھاتے وقت اکثر امام موصوف کا تذکرہ فرماتے تھے۔ اور جب میں اُن کی خدمت میں مکان پر حاضر ہوتا تھا تو امام صاحب کے حالات زندگی مؤثر پیرایہ میں بیان فرماتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں امام صاحب کی تصانیف کا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ جب ۱۹۱۳ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے گیا تو امام صاحب کی کوئی نہ کوئی تصنیف سفر و حضر میں اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ کیمیائے سعادت، احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال نے مجھ پر خاص اثر کیا، بعد کو اگرچہ میں نے ملحدوں اور دہریوں کی تصانیف اور مختلف مذاہب کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن ہمیشہ "توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین" کی دُعا دل سے نکلتی رہی۔ میرا اب تک یہ معمول ہے کہ ۱۴؍ جمادی الثانی جو امام صاحب کے وصال کا دن ہے صبح سے احیاء العلوم یا کیمیائے سعادت یا منہاج العابدین کا کوئی جز پڑھتا ہوں اور امام صاحب کی حیات طیبہ پر غور کرتا ہوں پھر بعد عصر فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتا ہوں۔

لکھنؤ کے قیام میں مولانا شرر مرحوم کے دلگداز اور دیگر مضامین و تصانیف کے مطالعہ نے اُردو ادب کا شوق پیدا کر دیا۔ شعر و سخن کا ذوق بھی امیرؔ، آتشؔ، غالبؔ اور حالیؔ کے کلام سے پیدا ہوا۔ اسلامی فرقوں کے باہمی مناظرے کی کتابیں اگرچہ اس زمانہ میں بہت دیکھیں، لیکن "جنگ ہفتاد و دو ملت" بجائے سکون قلب کے اُلجھن پیدا کرتی تھی۔ البتہ کتب تصوف اور ملفوظات بزرگان دین میں ایک دلکشی پاتا تھا۔ شیخ عطارؒ کی تذکرۃ الاولیا، عارف رومؒ کی مثنوی، اور فتوح الغیب حضرت

غوث الاعظمؒ اکثر پڑھا کرتا تھا۔

(۳)

سن ۱۹۱۵ء میں جب علی گڑھ گیا تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اگرچہ سرسید مرحوم کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا، لیکن ان کی مذہبی تصانیف خاص کر تفسیر القرآن کا کوئی بھولے سے بھی نام نہیں لیتا تھا۔ لکھنؤ کے قیام میں سرسید کی مذہبی تصانیف خصوصًا تفسیر نیچیریت کی تعلیم سُنا کرتا تھا، لیکن علی گڑھ میں دل نے کہا کہ مخالفین اسلام کی کتابیں تو پڑھتے ہو، کیا وہ درد ملّت رکھنے والا اسی دان سے بھی بدتر ہے' اب میں نے خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن اور دیگر تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ سورۂ انفال کی تفسیر میں جہاں سرسید نے جملہ غزوات ایک جا جمع کر کے لکھے ہیں مجھے بہت پسند آئے، خصوصًا غزوۂ بدر میں جو محققانہ بحث ہے، مجھ پر سرسید مرحوم کے خلوص، تلاش حق اور محبت اسلام کا ایک خاص اثر ہوا، اگرچہ بعض مقامات پر جہاں علوم جدیدہ سے مرعوبیت ٹپکتی تھی، میں اُن کی رائے سے متفق نہ تھا اور سلف صالحین کا متبع تھا۔ افسوس ہے کہ سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر نہ کی گئی۔ کاش علیگ بھی ندویوں کی طرح کچھ کرتے۔ اور مسلم یونیورسٹی دارالمصنفین کی طرح کوئی دینی کارنامہ پیش کرتی۔ میں یہاں کسی جماعت کو گرانا یا بڑھانا نہیں چاہتا ' صرف دل دردمند کا اظہار خیال ہے۔ خدا کرے ادھر بھی توجہ ہو۔

سرسید کی تصانیف کے ساتھ میں نے جسٹس امیر علی مرحوم کی اسپرٹ آف اسلام

اور ہسٹری آف دی سراسینز اور آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کا بھی غور سے مطالعہ کیا اور علامہ شبلی مرحوم کی الکلام، الغزالی اور رسائل سے مستفید ہوا۔ اب مجھ میں تاریخ و سیر کا شوق پیدا ہوا، اور کچھ خدمت دین بجالانے کے لئے تیار ہوا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب میرا تقرر بڑودہ کالج میں ہوگیا تو سب سے پہلے آنحضرت صلعم کی سیرت پاک پر دس مضامین سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے لکھنا شروع کئے۔ اُس زمانہ میں مولانا شبلی بڑودہ تشریف لے گئے اور جسٹس عباس طیب جی مرحوم کے بنگلہ پر پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا کی تصانیف مجھے پہلے ہی گرویدہ کرچکی تھیں، اب ان کے حسن اخلاق، لطف تقریر، ذوق سخن اور تبحر علمی نے اور بھی گرویدہ کرلیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تعطیلوں میں جب بھوپال جاتا تھا تو منشی منصب علی صاحب کے مکان پر مولانا سے اکثر شرف ملاقات حاصل ہوتا تھا۔

تذکرۃ المصطفیٰ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوگئی تو مولانا کا یہ ناقدانہ فقرہ کہ "کتاب پرانے رنگ میں اچھی ہے مگر ایک نئے تعلیم پائے ہوئے سے کچھ اور ہی اُمید ہے" تازیانہ کا کام کرگیا۔ اور میں نے فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ خصوصاً اسپنسر، ڈارون، ہکسلے، ہیگل، الیور لاج، ڈیلس، فلڈنگ اور برگسن کی تصانیف پر غور کرتا رہا، پھر معارج الدین کا حصۂ اول شائع کیا، مگر افسوس مولانا اُسی سال رحلت فرما چکے تھے۔

اس اثنا میں ہز ہائنس مہاراجہ صاحب گائیکواڑ نے علم موازنۂ مذاہب کی

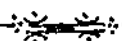
ایک شاخ ہندوستان میں سب سے پہلے بڑودہ کالج میں کھولوادی اور اُس کے ناظم پروفیسر وجری جو فرانس اور جرمنی میں الٰہیات کی تکمیل کر چکے تھے اور ہیسٹنگز کی انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن کے مضمون نگار تھے مقرر ہوئے۔ پروفیسر موصوف سے بہت جلد بے تکلفی ہوگئی، وہ علم موازنۂ مذاہب پر ایک کتاب لکھ رہے تھے اور میں نے تاریخ صحف سماوی لکھنا شروع کی تھی۔ اور مہاراجہ صاحب نے ایک کافی رقم فراہمی کتب کے لئے عطا فرمائی تھی۔ وجری صاحب نے کتب یہود و نصاریٰ کے معتبر ماخذ میرے لئے جمع کر دیے اور میں نے تفسیر حدیث، رجال، تاریخ اور سیر کی اسلامی مستند کتابیں فراہم کرلیں۔ اور اُن سے مستفید ہونے لگا اور وجری صاحب کو اسلام کے متعلق نوٹس لکھوانے لگا۔ تاریخ صحف کے خاتمے پر میں نے ان ماخذوں کی ایک فہرست دے دی ہے، لیکن چونکہ یہ کتاب جو ۱۹۱۹ء میں چھپی تھی اب کمیاب ہے اس لئے چند کتابوں کے نام جن سے خاص طور سے مستفید ہوا ہوں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) دیریورم ریفرنس بائبل (۲) ابوکریفہ جس کا ترجمہ انگریزی میں چارلس نے ۱۹۱۳ء میں کیا (۳) جوئش انسائیکلوپیڈیا (۴) وسٹ کاٹ کا ہسٹارک فیتھ۔ (۵) گرائٹز ہسٹری آف دی جیوز (۶) فان سوڈن کی ٹکس آف نیو ٹسٹامنٹ۔ (۷) ٹالمر کی ونٹر دپولوجی۔

تفاسیر میں اگرچہ کسی واقعہ کو تفسیر کبیر خازن ابن کثیر بیضاوی وغیرہ میں ایک

ساتھ دیکھتا تھا لیکن تفسیر ابن جریر خاص طور سے پیش نظر رہتی تھی اس میں موافق اور مخالف سب روایتیں کسی واقعہ کے متعلق جمع ہوتی تھیں ان کو پھر طبقات ابن سعد، اصابہ اور میزان الاعتدال کی کتب رجال سے جانچ کرکے کوئی رسلے قائم کرتا تھا۔ تفسیر صافی اور مجمع البیان بھی پیش نظر تھیں اور صحیحین کے ساتھ کافی بھی دیکھتا تھا۔ آج کل کی افسوسناک فضا میں میری پُرنم آنکھوں کے سامنے وہ وقت پھرتا ہے جب علمائے فرنگی محل اور مجتہدین دونوں ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے تھے۔

میں نے اپنی محسن کتابوں کے چند نام تحریر کردیے۔ اصل احسان مصنفین کا ہے، انھیں کا رہین منت ہوں اور اُن کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں باستثنائے ایک مصنف کے جو عالم الغیب حکیم و علیم ہے اور جس کی بارگاہ قدس میں سر نیاز جھکا کر یوں عرض کرتا ہوں ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا۔



از جناب مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ والادب دار العلوم دیوبند

مؤقر اور علمی رسالے "الندوہ" لکھنؤ میں ایک عرصہ سے عنوان بالا پر مضامین لکھے جا رہے ہیں، ملک کے ذی علم اور قابل فخر اہل قلم دلکش انداز اور مؤثر پیرائے میں اس پر طبع آزمائی فرما کر اردو ادب میں ایک نئے اور اچھوتے باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ سلاست بیان کے ساتھ ساتھ طبائع کی رنگینی نے بھی اس عنوان کو کچھ ایسا دلچسپ بنا دیا ہے کہ جدید مضامین تو بجائے خود قدیم مضامین کا اعادہ بھی قند مکرر سے کم نہیں ہوتا ہے حتیٰ کہ میں نے اپنے بعض سفروں میں بعض اہل علم کو والہانہ انداز میں اس کا ذکر کرتے ہوئے سُنا ہے۔

میرے لئے ارشاد ہے کہ میں بھی مذکورۂ بالا عنوان پر کچھ لکھوں، میں نے اس کی تعمیل بھی کرنی چاہی اور کئی بار کچھ لکھا بھی، لیکن جب کبھی تمہید کو ختم کر کے اصل موضوع پر عرض حال کا موقع ہوا تو اس خیال نے قلم کو آگے بڑھنے سے روک دیا کہ اس عنوان پر لکھنا انھیں اصحاب قلم کو زیبا دیتا ہے جن پر کتاب نے احسان کیا ہو اور انھوں نے اہلیت کے ساتھ اس کے احسانات کو قبول کیا ہو، یا مشاہیر کے درجہ میں ہوں تاکہ ان کی آپ بیتی سامعین کو اپنا مشتاق بنائے، یہاں یہ حال ہے کہ تحریر مضمون کے شرائط ہی مفقود ہیں تو میری گذارش بے وضو کی نماز نہ ہوگی تو کیا ہوگا، مگر ارشاد ہے اور موکد ارشاد ہے کہ اس مضمون پر مجھ کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، پس اگر تعمیل نہ کروں

تو کیا کروں۔

میرے سب سے بڑے بھائی حافظ تھے اور والدۂ مرحومہ سے سنا ہے کہ بہت اچھا قرآن پڑھا کرتے تھے، اُن کی نوعمری کا آغاز ہی تھا کہ دوست احباب کی رائے سے والدین کی بلا اجازت الہ آباد پہونچ گئے اور پولیس کانسٹبل بن گئے، طبیعت صالح تھی، چند ہی سال کے بعد سب انسپکٹر پولیس ہوگئے، غالباً جس روز سے بغرض تلاش ملازمت نکلے قرآن شریف کی سورتیں کبھی نماز میں پڑھی ہوں تو پڑھی ہوں، تلاوت کی غرض سے کبھی قرآن شریف ہاتھ میں نہ لیا۔

حفاظ سے سنا ہے کہ قرآن شریف کو یاد کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے، اس کو سینہ میں محفوظ رکھنا بہت زیادہ مشکل ہے، نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہوسکتا تھا کہ سب انسپکٹری تو مل گئی مگر قرآن شریف یاد نہ رکھ سکے۔ مرحومہ والدہ کو اس کا بہت سخت صدمہ تھا، ان کے والد (میرے نانا) اگرچہ علماء میں سے نہ تھے، مگر پرانے لوگوں کی طرح بہت زیادہ دیندار تھے، مجھ سے دو اور بڑے بھائی تھے اُن میں سے ایک نے اردو مڈل پاس کیا اور ریاست گوالیار وغیرہ میں بہ تلاش روزگار تشریف لے گئے۔ میرے دوسرے بڑے بھائی نے عربی شروع کی اور وہ میزان الصرف سے آگے نہ بڑھنے پائے تھے کہ والد مرحوم کے ایک دوست سید محمد علی صاحب سررشتہ دار کے اصرار سے عربی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور انگریزی میں انٹرنس پاس کیا۔

مرحومہ والدہ نے حفظ قرآن کے لئے مجھ کو ایک سن رسیدہ اور معمر حافظ صاحب کے

پاس پہونچوا دیا اور میں حفظ قرآن میں مصروف ہو گیا۔

مجھ کو یاد ہے کہ میں ایک روز اسی مکتب میں پڑھ رہا تھا جس میں مجھ کو حفظ قرآن کے لئے بٹھا دیا گیا تھا کہ اتفاقاً سید محمد علی صاحب مرحوم تشریف لائے، میں حافظ صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا مجھ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ حافظ صاحب نے فرمایا کہ منشی مزاج علی (میرے والد کا نام ہے) کا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صاحب میرے والد کے دوست ہیں، اس گفتگو کو سُن کر اس امید پر ان کو دیکھنے لگا کہ یہ خوش ہوں گے اور میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے، مگر خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم، سید صاحب مرحوم کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا اور بگڑ کر بولے کہ مزاج علی نے یہ کیا حماقت کی کہ اس معصوم بچے کو حفظ قرآن میں لگا دیا کیا ان کا یہ مقصد ہے کہ اس کو حافظ ہونے کے بعد قبروں پر تلاوت قرآن کی ملازمتیں کرنے اور فاتحہ کے حلوے کھانے پر مجبور کریں۔

میں اُس وقت بہت ہی چھوٹی عمر کا تھا، بعض الفاظ میں تو تلاپن بھی تھا کہ ان کو نقل کر کر کے میرے دوست ہنسا کرتے تھے، اس کم سنی کے باوجود مجھ کو یاد ہے کہ سید صاحب مرحوم کے یہ الفاظ مجھ کو بہت زیادہ گراں گزرے اور میں نے ان کے اس کلام کو توہین قرآن کے مرادف سمجھا۔

سید صاحب مرحوم خود انگریزی تعلیم یافتہ نہ تھے بلکہ شاید انگریزی کا ایک حرف بھی نہ جانتے تھے، پنج وقتہ نماز پڑھتے تھے، بعض مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے

پیش شدہ کاغذ کھلے چھوڑ کر نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں چلے آتے تھے، کچہری جاتے تھے تو عالمانہ وضع کا سیاہ جبہ پہن کر جاتے تھے انتہائی دینداری یہ تھی کہ اس علو مرتبت کے باوجود ایام محرم میں مہندی اپنے ننگے سر پر رکھ کر اور ننگے پاؤں چل کر چڑھانے جایا کرتے تھے۔ آگے آگے باجہ بجتا تھا اور پیچھے وہ خود بہیئت کذائی مع اپنے مسلمان عملہ کے ہوتے تھے۔ اس نہایت ہی مقدس رسم میں میں نے بھی کئی سال شرکت کی ہے۔

غرض سید صاحب مرحوم کی اس نامحمودسعی نے کامیابی حاصل نہ کی اور میں حافظ قرآن کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد ہی میری آنکھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ سید صاحب مرحوم کی پنشن ہوئی اور اس ضعیفی میں ان کو (خدا جانے کیوں) خیال آیا کہ ان کا چھوٹا بیٹا حافظ قرآن ہو۔

سید صاحب مرحوم صاحب ثروت تھے، اچھے اچھے استاد اس غرض کی انجام دہی کے لیے ملازم رکھے اور برسوں رکھے مگر ان کی آرزو پوری نہ ہوئی، میرا تو اب تک یہی خیال ہے کہ شاید خالق عز اسمہٗ کو سید صاحب مرحوم کی وہ عاجلانہ توہین پسند نہ ہوئی جو کلام قدیم کی ہو گئی۔

حفظ قرآن سے فراغت کے وقت میری عمر کیا تھی مجھ کو صحیح یاد نہیں ہے' اس قدر ضرور یاد ہے کہ بعض بعض لوگ میری موجودگی میں میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ منشی جی (والد مرحوم) نے از راہ تفاخر اس کو حافظ مشہور کر دیا ہے'

ورنہ ایسے صغیر السن بچے کا حافظ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

ان صاحبوں کا یہ کہنا کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا، کیونکہ میرے حفظ قرآن کی حقیقت اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ پہلی دفعہ قرآن شریف تراویح میں سنانے کی تکلیف آج بھی مجھ کو یاد ہے کہ رمضان المبارک میں سحری سے فارغ ہو کر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتا تھا، ضروریات انسانیہ کے لئے تو ضرور اپنی اس جگہ سے اٹھتا تھا مگر نماز بھی اسی جگہ پر پڑھتا تھا جس پر قرآن شریف یاد کرتا تھا، رات کے آخر حصہ سے یاد کرنا شروع کرتا تھا اور اسی چوکی سے تراویح کے وقت اٹھ کر مسجد چلا جاتا تھا، دو چار پارے پڑھنے نہ ہوتے تھے صرف سوا پارہ سنانا ہوتا تھا اور وہ بھی اس مشکل سے، اس صورت میں اگر لوگوں کو میرے حافظ ہونے کا انکار تھا تو بے جا نہ تھا۔

رمضان کی چھبیسویں تاریخ اور ستائیسویں شب میں قرآن شریف ختم ہوا، والدین کی خوشی کا تو ٹھکانا نہ تھا، میرے بڑے بھائی بھی خوش تھے ختم قرآن شریف کی اس رات کو اس طرح آرام سے سویا کہ سحر کے لئے مشکل سے اٹھایا جا سکا اور پھر سو گیا، مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے اس روز صبح کی نماز پڑھی ہو، والدہ مرحومہ خود بھی نماز کی پابند تھیں، خصوصیت کے ساتھ میری نماز کی نگرانی زیادہ کرتی تھیں، مگر میری تقریباً ایک ماہ کی محنت کا خیال یا کم عمری کا لحاظ مجھ کو جگانے سے مانع آیا، سو کر اٹھا تو مکتب میں آیا اور اس امید پر آیا کہ آج مکتب کے بچے اور خود حافظ صاحب بھی میری تعریف کریں گے۔ مجھ کو یاد نہیں کہ حافظ صاحب نے میری

موجودگی میں میری تعریف کبھی بھی کی ہو، مکتب میں حاضر ہوا تو ایک ساتھی نے آہستہ سے فقرہ چست کیا کہ چھبیس دن کے بعد گھر کے جیل خانہ سے ان کی رہائی ہوئی۔ حافظ صاحب نے اپنی معمولی سادگی کے ساتھ فرمایا کہ اس حفظ قرآن کا کوئی فائدہ اس کے بغیر نہیں کہ حافظ اس کے معنی سے بھی واقف ہو اور معانی قرآن کا سمجھنا عربی پڑھنے ہی پر موقوف ہے۔

حافظ صاحب کی کرامت کہیے یا خدائی قدرت کا کرشمہ کہ میں نے اسی وقت یہ عزم مصمم کر لیا کہ مجھ کو عربی پڑھنا ہے، اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ میرے عربی پڑھنے کا محرک قرآن شریف ہی ہے۔

یہ ہے میری ابتدا۔

حافظ صاحب ہی نے فارسی کے سلسلہ میں مجھ کو آمد نامہ شروع کرایا، وہ فارسی کے ماہر نہ تھے مجھ کو یاد ہے کہ مجھ کو گلستاں پڑھاتے وقت مترجم گلستاں سامنے رکھ کر ترجمہ کرایا کرتے تھے، اسی اثنا میں والد صاحب مرحوم کی تبدیلی قصبہ تلہر کی ہوئی، میں وہاں پہونچ کر مدرسہ گلشن فیض میں داخل ہوا۔ اس مدرسہ میں پچاس سے کچھ اوپر طلبہ پڑھتے تھے۔ ہر طالب علم فیس ادا کرتا تھا اور چنگی سے بھی غالباً آٹھ روپیہ ماہانہ بطور امداد ملا کرتے تھے، اس مدرسہ میں ایک ہی مدرس جناب مولوی مقصود علی خاں صاحب رحمہ اللہ تھے، ان کی صرف و نحو بہت اچھی تھی، طرز تعلیم اسی طرز کا تھا جس طرز کا اب سے ساٹھ ستر برس قبل پنجاب یا صوبہ سرحد

میں سُنا گیا ہے، میزان الصرف تو اول سے آخر تک بالفاظہ یاد تھی، منشعب کے
ابواب اور صرف صغیر محفوظ تھے، زبدہ بھی بالفاظہا یاد تھا، نحو میں نحو میر اور کافیہ
کے آخری چند اوراق کے علاوہ پورا کافیہ یاد تھا اور اس میں اس قدر شغف تھا
کہ اکثر اوقات سوتے کی حالت میں بجائے قرآن شریف کے میزان الصرف یا نحو میر
کے الفاظ زبان سے نکلا کرتے تھے۔ میں نے گلستاں بھی از سر نو شروع کی، اس مدرسہ
میں گلستاں کی جماعت بہت سے فارسی قواعد کے بعد گلستاں پڑھ سکتی تھی، مگر
خدا کا شکر ہے کہ مجھ کو قواعد سمجھ لینے کے بعد گلستاں میں زیادہ دشواری نہ ہوئی،
اس اثنا میں والد مرحوم کی پنشن ہوئی اور میں پھر شاہجہاں پور آگیا۔ اس وقت
میری تعلیم کے نگراں ایک ایسے بزرگ تھے جو عربی تعلیم سے قطعاً ناواقف تھے،
ان کی نگرانی کے نقصان ہی نے میرے کئی سال ضائع کر دیے، اپنی عمر کو
ضائع بھی کرتا تھا، مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ میں اپنی عمر ضائع کر رہا
ہوں، آخر ایک تدبیر سمجھ میں آئی اور نگرانی کرنے والے بزرگ سے میں نے کہا
کہ میری فارسی کی کتابیں باقی ہیں، جن صاحب کے پاس آج کل پڑھ رہا ہوں
ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور شاید وہ فارسی نہ بھی پڑھائیں اس لئے
سکندر نامہ پڑھنے کی اجازت مجھ کو دی جائے کہ مدرسہ عین العلم واقع شاہجہاں پور
میں داخل ہو کر پڑھ لوں، حسن اتفاق سے یہ اجازت مل گئی، مدرسہ میں پہونچا تو
وہاں کسی استاد کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا میری جد و جہد سے میری

حالت پر رحم فرماکر حضرت مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی نے آدھا گھنٹہ سکندر نامہ پڑھانے کے لئے عطا فرمایا میں نے اسی کو غنیمت سمجھا، چند ہی مہینوں کے بعد اساتذہ کی شفقت نے دو مدرسوں کے چھ گھنٹے ایک جماعت میں داخل کر کے مجھے دے دیے۔ اب میری عربی کتابیں بھی اس مدرسہ میں ہونے لگیں، اساتذہ کی اس عنایت نے ہماری جماعت کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ تحصیل علم میں طلبہ کو کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں ہم آزاد تھے پڑھتے وقت جو چاہتے تھے دریافت کرتے تھے۔ پڑھنے کے بعد مدرسہ میں رفع شکوک تو معمولی بات تھی جب چاہتے تھے گھروں پہ پہونچ جاتے تھے، اور حضرت مولانا سید بشیر احمد صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کو تو بہت مرتبہ سوتے سے اٹھا کر کتابوں کی عبارتوں کا مطلب دریافت کرنے کی نوبت آئی ہے۔ قادر مطلق ان کی قبر کو انوار رحمت سے بھرے، ان کو ہمارے اس طرز سے کبھی کوئی دل تنگی نہ ہوتی تھی، خارج از اوقات مدرسہ شرح وقایہ مجھ کو حضرت مفتی صاحب دہلوی مدظلہ نے دوپہر کا سونا چھوڑ کر پڑھائی ہے۔

اس اثناء میں میرے لئے ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا کہ گھر کے قریب ہی بازار تھا، اس میں آریہ عطار کی دوکان تھی، اس کی عمر غالبًا ساٹھ برس سے کم نہ ہوگی، میں جب کبھی اس کی دوکان پہ جاتا تھا تو تھوڑے سے وقت میں بہت سے اعتراض اسلام پر یا درسیرت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام پر کرتا تھا، ان

اعتراضوں سے بے چین ہوکر میں اپنے استادوں سے جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت کا مسئلہ میرے لئے لاینحل مسئلہ ہوگیا تھا، صرفی نحوی شذوذ قرآن میں موجود تھے ہی، مختصر المعانی اس وقت تک اگرچہ نہ پڑھی تھی، مگر فارسی قواعد تو معلوم ہی تھے، اسی حالت میں میں دارالعلوم دیوبند پہونچا، کچھ عرصہ کے بعد ضروری کتابوں سے فارغ ہوکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیضاوی شروع کی، سورۂ بقر کے اول ہی میں حروف مقطعات کی بحث ہے، مجھ کو حضرت قدس سرہٗ کی تقریر تو یاد نہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ اس کو سمجھنے کی مجھ میں اہلیت بھی نہ تھی، مگر اس قدر یقینی ہے کہ وہ پہلا دن تھا جس میں قرآن شریف کی طرف سے یہ ناپاک کھٹک میرے دل سے دور ہوئی۔

یہ ہے میری انتہا!

اب غالبًا میری گذارش سے واضح ہوگیا ہوگا کہ میرے علم ظاہری کا سبب بھی قرآن شریف ہے اور عقیدہ کی طہارت و نظافت کا سبب بھی قرآن شریف ہی ہے۔

قیام دارالعلوم دیوبند میں ایسی حالت میں کہ میں نورالانوار پڑھتا تھا اور ایک اور صاحب شریک درس تھے، مجھ کو مقامات حریری پڑھانے کے لئے تیار ہوئے۔ ان کی تعلیم نے علوم عربیہ سے محبت پیدا کرادی اور تو کچھ آیا نہیں مگر ادب کی عظمت دل میں اس قدر ہوگئی کہ حسن ظن رکھنے والے مجھ کو ادیب کہتے ہیں اور میں اپنے دل ہی دل میں

کہا کرتا ہوں ؎

لو صاحب آئے تاب کہاں اور ہم کہاں   احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

میں نے عرض کیا تھا کہ میری نحو و صرف کی تعلیم ایک ایسے استاذ سے ہوئی ہے جو اس طرز کے معلم تھے جس طرز کے معلم قدیم زمانہ میں صوبۂ سرحد یا پنجاب میں ہوتے تھے۔ مشکل مشکل صیغوں کی باقاعدہ تعلیلیں، پیچیدہ عبارتوں کی باضابطہ ترکیبیں پوری پابندی کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، اس لئے میں شرح جامی کو ختم کر لینے تک بجز درس نظامی کی نحوی کتابوں کے اور کسی کتاب کا مطالعہ نہ کر سکا۔

دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے مدرسہ نعمانیہ واقع پورینی ضلع بھاگلپور کے مدرس ادبی کے لیے مامور فرمایا تو وہاں کچھ موقع مل گیا کہ قومی مدارس کی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کروں، اس زمانہ میں میں نے مفصل کو بھی دیکھا، اور اوضح المسالک کا مطالعہ بھی کیا۔ اور اسی زمانہ میں الفیہ کی شرح ابن عقیل کو بھی دیکھا۔ زمخشری کی علمی عظمت کا مقتضا یہ ہے کہ میں مفصل کے مقابلہ میں کسی کتاب کا نام نہ لوں، مگر اس وقت جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مجھ کو دلچسپی کس سے ہوئی۔

سچ یہ ہے کہ میں نے افادی حیثیت سے اوضح المسالک کو مفصل پر ترجیح دی؛ اور اس کے بعد جب ابن عقیل کا مطالعہ کیا تو مجھ کو اس سے محبت ہو گئی، اس کتاب کو میں نے متعدد بار دیکھا اور چاہا کہ طلبہ اس کتاب کو پڑھیں، مگر مدرسۂ نعمانیہ مذکورہ ایک انجمن کے ماتحت تھا، اراکین انجمن سے حصول اجازت کے بغیر اس ارادے پر عمل کرنا

خلاف ضابطہ تھا، اور وہاں کے قدامت پسند ممبر اس کی اجازت نہ دیتے تھے اس لئے میں کامیاب نہ ہوا۔ دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو اپنے بڑے لڑکے کو پڑھانے کا موقع ملا، اس سلسلہ میں میں نے ایک جماعت کو ابن عقیل کی شرح پڑھائی، اور میرا خیال یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو بہت زیادہ نفع پہونچا، اور اس طرح میں نے اس کو خارج از اوقات مدرسہ کئی دفعہ پڑھایا، ابن عقیل کے اخلاص کی برکت کہ جس نے اس کو پڑھا وہ اس کا شیدا ہو گیا، آج کل بھی ہمارے یہاں ایک اطراف بمبئی کے ساکن جو انگریزی میں ایم اے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولوی فاضل (پنجاب)، کو معقول تنخواہ دے کر میزان الصرف پڑھتے پڑھتے ابن عقیل تک پہونچے ہیں، اُن کی تعلیم میں میرے مشورہ کو بھی دخل ہے، وہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ مجھ کو تو ابن عقیل کا ایک ایک لفظ پیارا معلوم ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ میرے نزدیک ایک زمانۂ دراز تک سلاست بیان، مقاصد نحویہ کی کی تکمیل اور حسن تفہیم میں ابن عقیل کی نظیر نہ تھی، دارالعلوم دیوبند کی حاضری کے بعد حضرت مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت میں نے کتاب سیبویہ کا مطالعہ کیا، اور آج تک چار دفعہ اس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔

اب میرا عقیدہ یہ ہے کہ کتاب سیبویہ ہی ایک ایسی کتاب ہے جو طالب علم کے سامنے نحو کے تمام علمی ذخائر رکھ دیتی ہے اور متعلم اپنی قابلیت کے موافق اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

طلبہ کے درس میں اس کو داخل کر دینا تو شاید غیر مفید بلکہ مضر ہو، لیکن شاید یہ نامناسب نہ ہو کہ جس وقت طالب علم میں کافیہ وامثالہا کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاوے، طالب علم کے مطالعہ میں یہ کتاب رہے اور کافیہ کے بجائے شرح ابن عقیل کو رکھا جاوے۔ نصاب کے متعلق میری ایک مستقل گذارش ہے، اگر موفق حقیقی نے توفیق عطا فرمائی تو کسی قریبی ہی فرصت میں آئندہ کے اہل علم ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا، تاکہ اگر ان پریشان خیالات میں کوئی چیز عمدہ ہو تو عمل فرمائیں ورنہ "کالائے بدریش خاوند" ادب کے سلسلہ میں معذور سمجھا جاوے اگر میں یہ عرض کروں کہ ع "معشوق من ست آں کہ بہ نزدیک تو زشت ست"۔ عصر حاضر کے علماء مقامات حریری سے ناراض ہیں صوبۂ آسام کے سرکاری عربی مدارس کے ممتحن ہونے کی حیثیت سے مجھ کو علم ہے کہ وہاں یہ مظلوم کتاب صرف پانچ مقاموں تک داخل ہے، انتخاب سوالات کے وقت میں اکثر متعجب ہوتا تھا کہ مقامات حریری کے ان چند اوراق کو داخل کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟ اگر تبرک ہی حاصل کرنا تھا تو طلبہ کو اس کی فقط زیارت کرا دی جاتی، اب سنا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس جزء لا یتجزی کو اپنے نصاب میں جگہ دے دی ہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ بعض حضرات تو حدود ادب سے متجاوز ہو کر کتاب و مصنف کتاب کی نسبت سقیم الفاظ استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں فرماتے ہیں، لیکن میں مقامات حریری کا مداح ہوں اور سمجھتا ہوں کہ حفظ معانی لغات، اور لغات کے مختلف استعمالات، علم بدیع کے تفننات وغیرہا کی حقیقت جس طرح یہ کتاب انکشاف کرتی ہے

دوسری کتاب اس کے مساوی میرے علم میں نہیں ہے، اس لئے کم از کم پچیس مقامے داخل درس ضرور رہیں، اسی کے ساتھ تاریخ یمینی کا کوئی معتد بہ حصہ بھی داخل درس رہنا ضروری ہے۔

متاخرین کے دواوین میں دیوان بحتری کو بار بار ذوق و شوق سے دیکھا، لیکن بالعموم شعرائے جاہلیت کے کلام میں جو آمد و انسجام ہے متاخرین میں ان اوصاف کو محسوس نہ کر سکا، شعرائے جاہلیت میں امرء القیس کا کلام مجھ کو زیادہ پسند ہے، متاخرین شعراء میں ابو العلاء معری کی سقط الزند مع اس کی شرح تنویر کے نیز ابن فارض کے قصائد آج بھی میرے سرہانے رکھے ہوئے ہیں۔ بہت سے علماء سوتے وقت ادعیہ ماثورہ پڑھ کر سوتے ہوں گے اور (افسوس) میں ان کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے سوتا ہوں۔

ادب کے لئے میرے خیال میں جس طرح صرف و نحو ضروری ہیں اسی طرح معانی و بیان بھی ضروری ہیں، معانی کے مصطلحات اور مختصر سی حقیقت سامنے آجانے کے لئے مختصر معانی (جو ہمارے قومی مدارس میں متداول ہے) پڑھ لینا طالب علم کے لئے ضروری ہے، اس کے بعد دلائل الاعجاز یا مطول کا مطالعہ کافی ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ طلبہ کو اولاً سہولت اور اختصار کے ساتھ فن اور مصطلحات فن سے روشناس کرا دیا جائے اور اسی اثنا میں اساتذہ اپنے اثرات سے کام لے کر متعلمین میں وہ اہلیت پیدا کر دیں کہ جس کی وجہ سے طلبہ بہ شوق و رغبت

مدرسہ میں آیا کریں اور ان کے تخیل میں مدرسہ اور جیل خانہ دو جدا جدا چیزوں کا نام ہو، اسباق کے اوقات ان کے لئے قیدی کی مشقت کے اوقات کا نام نہ ہو، بنا برطلبہ جس وقت طلبہ میں مفردات لغت کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے اُن کو اہل لغت کا مختصر طرز سمجھا کر مختار الصحاح یا اُس جیسی کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرایا جاوے اور جب اُن میں عربی دانی کی وسعت ہو جاوے تو منتہی الادب اس کے بعد لسان العرب سے کام لینا سکھایا جاوے۔

اقرب الموارد پر زیادت تسہیل کے باوجود مجھ کو بہت سے شبہات ہیں، اور منجد (جو آج کل قومی مدارس کے اکثر طلبہ کے پاس موجود ہے) بھی میرے نزدیک لغات جدیدہ کے لئے تو ایک حد تک مفید ہے مگر عربیت قدیمہ خصوصًا تفسیر و حدیث میں اس سے استمداد زہر ملے ہوئے شہد سے کم نہیں ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا الحاج الحافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند قدس سرہٗ جب عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے منصب افتاء پر قائز ہوئے تو اعزازاً علی بھی ہمرکاب تھا، فتاوے نویسی کا اتفاق پہلا ہی تھا، اُس زمانہ میں مجھ کو مجلہ عدلیہ اور الجج الواضحہ فی البینات الراجحہ سے بہت مدد ملی جس کی وجہ سے میں آج بھی ان کے مصنفین کو دعائیں دیتا ہوں۔ اول الذکر کتاب تو آج بھی میرے پاس ہے اور کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، سنا ہے کہ کسی عیسائی نے اس کی شرح بھی کی ہے۔ اس شرح کے ذریعہ سے حوالے بکثرت مل جاتے ہیں، مگر مؤخر الذکر کتاب جس کو فقہ کی

انسائیکلوپیڈیا کہنا ناموزوں نہیں کمیاب ہے، ان دونوں کتابوں کا تعلق معاملات سے ہے۔

وسعت نظر کے لئے شاید یہ دونوں کتابیں معین نہ ہوں، مگر قضا کے مسائل بہت آسانی سے مل جاتے ہیں، وسعت نظر کے لئے میرے خیال میں بدائع سے عمدہ کتاب کوئی نہیں ہے۔

شرح وقایہ کا اگر میں بالکل ذکر ہی نہ کروں، کیونکہ پڑھنے کے بعد بار بار پڑھانے کی نوبت آئی، لیکن اپنی عدم اہلیت کی بنا پر میں اس سے زیادہ مستفید نہ ہوسکا تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

شرح نقایہ دو ہیں۔ ایک مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی، دوسری قہستانی کی، مؤخر الذکر نسخہ قلمی دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں ہے، اول الذکر قازان میں طبع ہوا، ہندوستان میں میں نے کئی جگہ نقلیں بھی دیکھیں مگر غالباً سب مطبوعہ قازان ہی سے منقول ہیں، کیونکہ اغلاط فاحشہ میں منقول اور منقول عنہ برابر ہیں۔ ایک نسخہ میرے پاس بھی ہے جس کو میں مدینہ منورہ سے خرید کر لایا تھا، وہ بھی مطبوعہ قازان ہی ہے، ہندوستان میں اس کی صرف ایک جلد تا آخر کتاب الحج طبع ہوئی ہے، دوسری تا آخر کتاب الوقف زیر طبع ہے۔

شرح نقایہ کے اس نسخہ کے متعلق میری تحسین اگرچہ ناشناس کی تحسین کیوں نہ ہو مگر میں تو اس کو ملا علی قاری رحمۃ اللہ کے علوم کا طغرائے امتیاز سمجھتا ہوں، تقلید جس غلط

معنی میں ہندوستان میں شائع ہوگئی ہے اُس کا ازالہ اسی کتاب سے ہوسکتا ہے"

میری رائے ہے کہ ابتدائے طفولیت ہی سے بچوں کو اخلاق و تصوف کی طرف مائل کیا جائے، یہ امر آخر ہے کہ عملی ہو کتابی نہ ہو اور ان کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس تعلیم کا بھی نشو و نما ہو۔

مجھ کو اپنی کسی قریبی گذارش میں بسلسلۂ اصلاح نصاب اس کے متعلق اپنے خیالات کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ہے، اس لئے اس وقت صرف اس پر ختم کرتا ہوں کہ اگر ریاض الصالحین جس کے مؤلف علامۂ نووی ہیں داخل نصاب نہ کی جاسکے تو کم از کم درجۂ وسطانی کے طلبہ پر اس کا مطالعہ لازمی کر دیا جائے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کی تصنیفات کا مطالعہ میں اُن طلبہ کے لئے مفید سمجھتا ہوں جو فنون درسیہ سے واقف ہو چکے ہوں۔



ازمولانا شاہ حلیم عطا صاحب استاذ تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء

میرے خاندان میں خدا کے فضل و کرم سے علم اور دین کئی صدی سے چلا آرہا ہے، مشیخت و سجادگی کے باوجود مشائخ کو علوم سے برابر اشتغال رہا اور بعض حضرات صاحب تصانیف بھی ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ابوالفضل ظہیرالدین عرف شاہ پناہ عطا صاحب کے نام جو خطوط بھیجے ہیں اور حضرت شاہ رفیع الدین علیہ الرحمۃ نے اپنے بعض علمی تحفوں پر جو الفاظ لکھے ہیں اُن سے اس خانقاہ کے بزرگوں کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔

با ایں ہمہ ماحول خانقاہی اثرات اور صوفیانہ خصوصیات سے خالی نہ تھا، خاندان کا عام ذوق اور رجحان طبع تصوف اور اُس کے متعلقات کی طرف تھا، اس ماحول میں میرے عم محترم شاہ حسام عطا صاحب مرحوم خاص خصوصیات کے مالک تھے، شب بیداری اور مداومت ذکر کے علاوہ وہ ایک سلیم الفہم حق شناس اور وسیع القلب بزرگ تھے معاصرین کے فضل کا کشادہ دلی سے اعتراف کرتے تھے؛ سلسلہ اور خاندان کی عصبیت سے پاک تھے اور بعض متبع سنت اور متورع معاصر بزرگوں کا بڑی عظمت اور عقیدت سے ذکر کرتے تھے اور اکثر سلف صالحین اور صوفیہ کے تذکرے سنایا کرتے تھے، جس سے صلحاء کی محبت کی تخم ریزی ہوتی تھی۔

میری عمر دس گیارہ برس کی تھی کہ چچا مرحوم ہر جمعہ کو تفسیر فتح العزیز اور بخاری کی احادیث کا ترجمہ سنایا کرتے، ان سے سنی ہوئی حدیثیں آج تک دل پر نقش ہیں۔

میری عمر کا بارھواں یا تیرھواں سال تھا کہ عم محترم نے سورۂ جن کی آیت وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا کی تفسیر فتح العزیز سے پڑھ کر سُنائی، اس سے سب سے پہلے شرک کی حقیقت سمجھ میں آئی اور توحید کا پہلا نقش دل پر قائم ہوا۔

مولوی معین الدین صاحب ٹونکی نے والد رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ مہدی عطا صاحب سجادہ نشین خانقاہ کریمیہ سلون کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی "الدین الخالص" ہدیۃً بھیجی تھی، طالب علمی کے زمانہ میں اس کا مطالعہ کیا اور اس سے اثر لیا۔

حدیث میں نے اپنے برادر اکبر مولانا شاہ نعیم عطا صاحب سے شروع کی جو حدیث میں استاد الہند حضرت شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی کے شاگرد ہیں۔ بھائی صاحب کو حدیث کا ذوق تھا اُس کے اثر سے مجھے بھی حدیث کا شوق پیدا ہوا اُسی زمانہ میں صحیح مسلم کو اس کی شرح کی مدد سے اور بخاری کو فتح الباری کی مدد سے دیکھتا، حدیث کے علاوہ ذاتی شوق سے سیوطی کی مزہر، ثعالبی کی فقہ اللغۃ، نووی کی اذکار، التبیان فی آداب حملۃ القرآن اور ریاض الصالحین کا مطالعہ کرتا تھا، علامہ نووی کے کلام میں بالعموم بڑی حلاوت اور نورانیت معلوم ہوتی تھی۔

۱۳۲۹ھ میں میری خوش قسمتی سے خانقاہ میں مولانا سید ابو الحسن علی صاحب دہلوی کا ورود ہوا، آپ حدیث میں میاں سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے، فقہ میں مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کے والد ماجد مولانا عبد الحلیم صاحب

فرنگی محلیؒ کے اوراد ب میں مولوی حامد حسین صاحب اور اُن کے بھائی مولوی احمد حسین صاحب کے شاگرد تھے۔ لیکن آپ پر میاں صاحب کے تلمذ کے اثرات زیادہ غالب تھے، سلفیت کا رنگ بہت گہرا اور حدیث اور سلف کی کتابوں کا بڑا شغف تھا، نہایت عابد اور متورع بزرگ تھے۔ آپ کی تحریک اور تشویق سے امام ابن جوزی کی تلبیس ابلیس اور صفۃ الصفوۃ امام ابن تیمیہ کی الواسطہ بین الخلق والحق، امام ابن قیم کی زاد المعاد، امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات اور محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل بار بار پڑھی اور دل میں اُتار لی، جہال صوفیہ کی بدعات کی ظلمت سے نکلنے میں کتاب الواسطہ اور تلبیس ابلیس سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ اسی زمانہ میں صحیحین اور مؤطا بالخصوص صحیح مسلم سے زیادہ اشتغال ہوا، چونکہ نووی کی شرح موجود تھی جو طلبہ کے لئے بڑی مفید سہل اور ایک حد تک دلچسپ بھی ہے اور چونکہ مجھے نووی سے عقیدت تھی اس لیے صحیح مسلم کو زیادہ ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ دیکھا۔

مولانا نابینا ہوجانے کے بعد مجھ سے تلبیس ابلیس، شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل (ابن قیم) اور غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی (آلوسی زادہ) پڑھوا کر سنا کرتے تھے، اس طرح ان سلفی عقائد و خیالات کے نقش گہرے اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔

۱۳۴۲ھ میں مولانا محمد سورتی صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے، ان کی وجہ سے

بڑی نادر علمی مجلسیں اور پرلطف صحبتیں رہتی تھیں جن میں کثرت سے سلف کی کتابوں کا تذکرہ رہتا تھا، میں اور محب گرامی مولانا سید طلحہ اور صدیق محترم مولانا خلیل بن محمد عرب اور دوسرے ہم مذاق اور ہم خیال احباب ان مجالس میں شریک ہوتے اور علمی مذاکرہ اور گفتگو کرتے، انھیں مجلسوں میں علامہ ابن حزمؒ سے میرا خاص تعارف ہوا، مولانا سورتی ان کی جامعیت اور تبحر کے بڑے معترف اور مداح تھے، ان کی گفتگو سے مجھے ابن حزم کی تصنیفات کی طرف توجہ ہوئی، ان کی کتاب الفصل فی الملل والنحل تو پہلے دیکھ چکا تھا اب ان کی اور تصنیفات بھی دیکھیں۔

ابن حزم کی تحقیقات میں مسئلۂ عصمت انبیاء اور قرآن مجید کے طرق نقل کی بحث کو میں نے بہت پسند کیا اور ان مسائل پر امام ابن تیمیہ اور بعض دوسرے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس پر علامہ ابن حزم کی تحقیق اور بحث کو ترجیح دیتا ہوں۔

مولانا خلیل عرب صاحب کی گفتگو اور علمی مذاکرہ سے جرجانی کی تصانیف بلاغت اور امیر المومنین یحییٰ یمنی کی جلیل القدر تصنیف طراز سے اشتغال ہوا اور درس نظامی کی کتابوں سے طبیعت ہٹی اور ان کی رہنمائی اور رفاقت میں ندوہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد مجھے سلف کی کتابوں کو خریدنے اور ان کے مطالعہ کا ولولہ پیدا ہوا خصوصیت کے ساتھ جن علماء سلف کی اکثر تصنیفات کا میں نے مطالعہ کیا وہ حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن رجب، ابن الہادی، ذہبی ابن حجر عسقلانی، محمد بن ابراہیم وزیر یمانی، محمد بن اسمٰعیل امیر یمانی، محمد بن علی شوکانی، نواب صدیق حسن خاں۔

امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی جن تصنیفی خصوصیات نے مجھے متأثر کیا وہ ان کی توحید وسنت کی دعوت، دلچسپ اور آسان مگر پُر زور اور مدلل طرز بیان، اور قرآن وحدیث کا بے نظیر استحضار واستدلال ہے۔

لیکن اس تاثر کے باوجود شیخین کی تصانیف میں چند مسائل شاذہ سے طبیعت کو اختلاف رہا۔ ایک اثبات صفات میں ان کا مبالغہ جس کے متعلق محمد بن ابراہیم وزیر نے الروض الباسم میں لکھا ہے وبعض کلامھما یکاد یفضی الی التجسیم، اس بارہ میں امام بیہقی اور ابن جوزی کی روش زیادہ مرغوب رہی۔

اسی طرح بعض مسائل فقہیہ مثل مسئلۂ طلاق ویمین وغیرہ اور دقائق معقولات نیز ذات وصفات کے مسائل میں ان کی دقیقہ سنجیوں سے جو زیادہ تر منہاج السنۃ اور کتاب العقل والنقل اور بعض دوسری کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں کبھی دلچسپی نہیں ہوئی علیٰ ہذا القیاس شدِّ رحال کے مسئلہ میں حافظ ابن حجر کا یہ قول کہ وہی من ابشع المسائل المنقولۃ عن ابن تیمیہ کو صحیح سمجھتا رہا۔

منہاج السنہ میں فضائل اہلبیت کی احادیث پر جو متشددانہ کلام منہاج السنہ میں امام نے کیا ہے اُس سے ہمیشہ تکلیف محسوس کرتا رہا اور دل کو تہا بیدی۔

مجھے امام ابن تیمیہ کے مختصر رسائل جن میں توحید و سنت کی دعوت ہے وہ زیادہ پسند آئے۔

الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، منہاج السنہ کے بعض مباحث اور فصول در الصارم المسلول علی شاتم الرسول، میرے نزدیک امام کی منتخب کتابوں اور مباحث میں سے ہیں۔

امام ابن قیم کی تصنیفات میں سے میرے مذاق کی مدارج السالکین، الجواب الکافی، عدۃ الصابرین، زاد المعاد ہیں، ان کی کتابوں اور کلام کے متعلق مجھے شوکانی کی اس رائے سے لفظ بلفظ اتفاق ہے «طویل النفس فی کتبہ اذا تکلم اسھب بطول ذیول لہ، وکلامہ فی کتبہ مما تعشقہ الافہام وتکاد تاکلہ العیون وتشربہ القلوب»۔

ابن قیم کی کتابیں میرے نزدیک امام ابن تیمیہ کے متن کی شرح ان کے اجمال کی تفصیل اور ان کا نقش ثانی ہیں۔

اگر کسی کو امام ابن تیمیہ کی سب کتابیں دیکھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ فتاویٰ اور مجموعۃ الرسائل کا مطالعہ کرے، ان کی سب خصوصیات سامنے آجائیں گی، اسی طرح سے امام ابن قیم کی زاد المعاد کا حال ہے، تفاسیر منقولہ میں اگر کسی کے پاس صرف تفسیر ابن کثیر اور کتب تاریخ میں صرف البدایہ والنہایہ ہو تو ان فنون میں وہ بہت حد تک مستغنی ہو سکتا ہے، ابن کثیر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معرکۃ الآرا مسائل میں صرف صحیح روایات سے فیصلہ کرتے ہیں۔

از مولانا عبدالعزیز صاحب میمن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

پہلے پہل جب میں کاٹھیاوار سے دہلی آیا تو چونکہ اردو اور فارسی دونوں سے نابلد تھا اس لئے تین سال صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم میں ضائع ہوئے، اور شرح جامی تک پہونچا، اس کے بعد یکایک توفیق الٰہی نے رہنمائی کی اور معلوم ہوا کہ میں غلط راستہ پر جارہا ہوں، چنانچہ یہ سب میں نے چھوڑ دیا، اساتذہ کو بہت کم تکلیف دی، اور زیادہ تر اپنی کاوش پر اعتماد کیا اور حسب ذیل کتابوں کو مع شروح کے بہت غائر نظر سے مطالعہ کیا، صرف میں شروح شافیہ، نحو میں شرح المفصل الاشباہ والنظائر اور بعض قلمی متون اسفرائنی کا لب الالباب و تسہیل الفوائد وغیرہ، الغرض فقہا اور منطقیین کی نحو سے نجات ملی۔ کافیہ کے بعض غلط سلط مسائل نے ہم کو نحو سے بیزار کیا، مثلاً لا یضاف موصوف الی صفتہ ولا صفۃ الی موصوفہا وجامع الغربی ونحوہ شاذ حالانکہ پوری عربی زبان ان اضافتوں سے لبریز ہے، نیز بعض اس قسم کی چیزیں جن میں تاویلات کا دروازہ کھولا گیا ہے اور ناحق ایک متعلم نحو کو فضول کی کنج کاوی اور مدافعت یا حملہ کی مصیبت میں پھنسایا ہے ان کتابوں سے بدظن کر دیا کہ طالب علم کا مقصد اپنی عربیت کی اصلاح ہے نہ کسی شخص کی جنبہ داری۔

پھر مفصل اور کتاب سیبویہ کے مطالعہ نے ادب کی طرف متوجہ کیا۔ شواہد نحویہ کی تلاش نے ان دیوانوں اور ان کی شروح کی طرف پہونچایا، ادب کے سلسلہ

میں معلوم یہ ہوا کہ ہم غلط راستہ کی طرف جارہے ہیں، ہم کو مفردات یاد کرنے چاہئیں اور مفردات سے بھی پہلے ضرورت ہے کہ ثلاثی مجرد کے ابواب یاد کیے جائیں، یہ سب سے مشکل کام ہے اس لئے کہ اس میں قیاس کوئی مدد نہیں کرتا، اس کے بعد پھر مفردات لغویہ کو یاد کرنے کے لئے ان ان کتابوں پر نظر رہی اور یاد کیں کفایۃ المتحفظ فقہ اللغۃ ثعالبی، الفاظ الکتابیہ (ہمدانی)، نظام الغریب وغیرہ، اور اس سے آگے بڑھ کر اصلاح المنطق اور تہذیب الالفاظ وغیرہ وغیرہ۔

کسی زمانہ میں معلقات عشر اور پانچ سات اور قصیدے جن کو عربی میں بہترین کہا جاتا ہے اور معلقات کے درجہ کے سمجھے جاتے ہیں ان کو یاد کیا، علاوہ بریں مجامیع ادبیہ اور دواوین شعریہ جن کا بیشتر حصہ یاد کیا وہ حسب ذیل ہیں دیوان متنبی اور حماسہ (تقریباً مکمل حفظ) جمہرۃ اشعار العرب، مفضلیات، نوادر ابی زید، کامل مبرد کتاب البیان والتبیین، ادب الکاتب مع اقتضاب۔

میں نے حماسہ، متنبی، مقامات، اور سقط الزند، ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم سے پڑھی، ڈپٹی صاحب کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی، ان کو عربی نظم کا بہت عمدہ مذاق اور اس پر زبردست قدرت تھی، مگر ان کی ادبی قابلیت، کچھ خدا دا دتھی، کتابوں کی رہین منت نہیں معلوم ہوتی تھی، وہ میرے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آتے، افسوس ہے کہ سقط الزند کے ایک شعر پر میری ان کی مفارقت ہوگئی سقط الزند میں تین شعر ہیں۔

وعلى الدهر من دماء الشهيدين سين علي ونجله شاهدان

فهما في اواخر الليل فجران وفي اولياته شفقان

ثبتا في قميصه ليجيئ الحشر مستعديا الى الرحمن

ثبتا رتثنیہ مذکر غائب) کو ڈپٹی صاحب نے ثبتا (مصدر) پڑھا میں نے کہا کہ شعر نثر ہو گیا'

پھر میں نے تقطیع کر کے بتایا ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔

شہرِ می گویم بہ از آب حیات — من ندانم فاعلاتن فاعلات

میں نے کہا "لیکن من می دانم فاعلاتن فاعلات چہ کنم" یہ سنہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے'

پھر میں نے ڈپٹی صاحب کو تکلیف نہیں دی اگرچہ ان کی تواضع سے مجھے اُمید تھی کہ وہ مجھے استفادہ کا موقع دیں گے۔

ڈپٹی صاحب مرحوم کو عربی نظم پر جو قدرت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں امیر حبیب اللہ خاں تشریف لانے والے تھے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے ایک عزیز صاحبزادہ ایف، اے میں پڑھتے تھے اس وقت منتخب دیوان ابی العتاہیہ نصاب میں داخل تھا جس میں سے وہ قصیدہ امیر صاحب کے سامنے پڑھنے کے لئے انتخاب کیا گیا جس کا مطلع ہے:-

لا یذھبن بک الامل — حتے تقصر فی الاجل

طالب علم نے کہا کہ میں یہ ابیات تین منٹ میں ختم کر لوں گا آپ کچھ اشعار کا

اضافہ فرما دیجئے، چنانچہ ڈپٹی صاحب نے یہ گرہ لگائی اور حق یہ ہے کہ خوب لگائی۔

الله قد دنی الاجل   الا غبا ٹا بیدہ عمل

النصح لیس بنافع   والسیف قد سبق العذل

والموء لیس بخالد   والعیش امر محتمل

کن حیث شئت من السهــول و فی البروج و فی القلل

یدرکک موت فی الزمــان ولا یزید لک فی الاجل

لذات دنیا کلها   سُمٌّ مشوبٌ بالعسل

العمر فان فانجا   والموت أتٍ فالعجل

حتی م تقلید الهوی   والی م تعقید الحیل

المبتلی بعلائق الدنیا   حمار فی الوحل

ڈپٹی صاحب کی حاضر دماغی اور ادبیت کا اندازہ اس لطیفہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملے، اتفاق سے عید کا دن تھا، ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور وجہ حبیب والا شعر پڑھا۔

عید کا دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے اس شعر میں خاص نکتہ پیدا کر دیا اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے۔

اب میں بعض مشہور ادبی کتابوں کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتا ہوں۔
میرے نزدیک الغریب المصنف ابن سلام اور اصلاح المنطق دو کتابیں ہیں

جن کا یاد ہونا ایک ادیب کے لئے نہایت ضروری ہے ۔

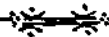
ہمارے ہاتھ میں اس وقت کوئی اتنی جامع کتاب نہیں ہے جس کے مصنف کو اتنے لئے علے ماخذ ملے ہوں اور اس نے ہر نحوی مسئلہ کے متعلق جس کا تعلق کسی بیت سے ہو، نیز شعر و شاعری کے متعلق قدیم ترین ماخذوں سے انتہائی محنت کے ساتھ اتنا ضروری مواد فراہم کر دیا ہو جتنا کہ خزانۃ الادب میں ہے، مصنف کو اولین و ثانین کے کلام پر اتنا عبور حاصل ہے اور اس کے پاس اتنا ذخیرہ موجود ہے جس کی مثال ہم کو نہیں ملتی، گویا ہنوز اس کے پیدا ہونے کا زمانہ نہیں آیا، اس کو اکیسویں صدی میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

حماسات میں انتخاب ابوتمام کا سب سے بہتر ہے، لیکن ترتیب و تبویب اور گندگی سے پاک ہونے کے اعتبار سے بحتری کے حماسہ کو فوقیت ہے، نوادر کے اعتبار سے خود ابوتمام کا وحشیات جو الحماسۃ الصغری کے نام سے مشہور رہی ممتاز ہے اور شعر و شاعری کی تنقید میں حماسۃ الخالدین سے بہتر کوئی کتاب نہیں، حماسۂ بصریہ اور حماسۂ مغربیہ بہت معمولی چیزیں ہیں، اول الذکر قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں ہے اور آخر الذکر حیدر آباد میں اور میرے پاس بھی اس کے دو نسخے ہیں ۔

نقد الشعر کے موضوع پر قراضۃ الذہب ابن رشیق اور رسالۃ الانتکار لابن شرف، حماسۃ الخالدین، شرح المختار من اشعار بشار، ہر مضمون کے متعدد شعروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین کتابیں ہیں اور بعض حیثیتیں جو نقد الشعر کی ہیں اُن کے لئے

ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے، الموشح فی ماخذ العلماء علی الشعراء للمرزبانی بھی اچھی کتاب ہے، فہم شعر کے لئے لآلی بہترین کتاب ہے۔

ابن خلدون نے جن کتابوں کو اصول فن ادب قرار دیا ہے ان کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ کامل للمبرد ایک مبتدی کے لئے زیادہ مفید ہے، ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے، کتاب البیان والتبیین میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں اور نوادر لغت و شعر امالی لابی علی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔



از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ

میں اپنے باپ، ماں بلکہ اُن سے زیادہ اپنے دادا کی سب سے لاڈلی اولاد ہوں، میرے باپ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے علاوہ اُن کی سات لڑکیاں تھیں، جن میں ایک کے سوا سب میرے والد کے بعد پیدا ہوئیں، اس لئے قدرتی طور پر دادا میرے والد اور میرے والد کی اولاد سے انتہائی محبت رکھتے تھے، اتفاق سے میرے والد کی اولاد کا سلسلہ لڑکیوں سے شروع ہوا اور چند سال کے عرصہ میں پے بہ پے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، اس کے بعد میری ولادت ہوئی، اب غور کیجئے کہ جس شخص کے گھر میں پے در پے سات لڑکیاں پیدا ہو چکی ہوں، اور اُس کے بعد اُس کے محبوب لڑکے کی صلب سے بھی متصل تین لڑکیاں پیدا ہوں وہ اُس کے اولاد نرینہ کی پیدائش کا کس قدر مشتاق اور خواہشمند ہوگا؟ ایسی حالت میں میری ولادت نے میرے دادا کی اشتیاق آمیز مسرت میں غیر معمولی اضافہ کیا، خوش قسمتی سے اس وقت خاندان فارغ البال تھا کاشتکاری اور زراعت کے علاوہ جو آبائی پیشہ تھا، تیل اور شکر کی تجارت ہوتی تھی، اس لئے دیہاتی نقطۂ نظر سے گاؤں میں ہمارا خاندان ایک دولت مند خاندان شمار کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ میرے دادا ایک باحوصلہ اور فیاض شخص تھے، اس لئے انھوں نے میری ولادت پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا، غربا اور رعایا کو دیہاتی پیمانے پر روپیے، پیسے اور کپڑے تقسیم کئے، اور گاؤں بھر کی دعوت کی، اس سے اتنا نتیجہ تو ہر شخص نکال سکتا ہے کہ میں اپنے بھائی بہنوں میں اپنے باپ ماں کی سب سے محبوب

اور سب سے خوش قسمت اولاد ہوں، میری اس خوش قسمتی کا آغاز یوم ولادت ہی سے ہوا اور الحمد للہ کہ اب بھی مختلف حیثیتوں سے اپنے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت اور ممتاز ہوں، اس پر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور دل میں یہ حسرت رکھتا ہوں کہ میرے اور بھائی بہن کم از کم میرے برابر خوش قسمت کیوں نہ ہوئے گزشتہ اور موجودہ خوش قسمتی کو اگر صغریٰ و کبریٰ بنایا جائے تو کم از کم شاعرانہ طور پر اس سے یہ نتیجہ بھی نکلے گا کہ اگر توفیق الٰہی نے مدد کی اور ابر رحمت کی چادر نے اپنے سائے کو پورے طور پر پھیلایا تو انشاء اللہ آخرت میں بھی خوش نصیب ہی رہوں گا۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

لیکن اس خوش نصیبی کے ساتھ یہ افسوس ہے کہ میری پیدائش کے چند ہی سال بعد میرے دادا کا انتقال ہو گیا، اس وقت مجھ کو صرف اس قدر ہوش تھا کہ اب تک مجھے ان کی صورت یاد ہے، باتیں یاد نہیں، اُن کی وفات کے بعد کا ایک اور واقعہ یاد ہے، میرے دادا کی قبر ایک مختصر سے باغ میں ہے جو ہمارا خاندانی قبرستان ہے، خاص میرے دادا کی قبر پر آم کا ایک درخت سایہ افگن ہے، ایک بار اپنے بچپن میں آموں کی فصل میں اس قبرستان میں گیا تو اپنے دادا کی قبر پر ایک پختہ آم گرا ہوا دیکھا، ساتھ میں ایک عزیز تھے، انھوں نے آم اُٹھا کر مجھ کو دیا اور کہا کہ لو اس کو تمہارے دادا نے تم کو دیا ہے، اس پر مجھے انتہائی مسرت ہوئی، اور آج واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مسرت کے ساتھ حسرت بھی ہوتی ہے، غرض میری تعلیم کا سلسلہ میرے

دادا کی زندگی میں شروع نہ ہوسکا بلکہ میرے والد نے میری تعلیم کا انتظام کیا، اس موقع پر صداقت کے ساتھ مجھ کو یہ بتا دینا چاہئے کہ میرے دادا ایک دیہاتی اَن پڑھ شخص تھے صرف زراعت و تجارت کے ذریعہ سے دولت پیدا کی تھی، ملازمت اور دوسرے علمی ذرائع معاش سے ہمارا خاندان ناآشنا تھا، لیکن میرے والد نے کسی قدر ترقی کی، اور قدیم مکاتب میں فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی، تجارتی اغراض سے ہندی بھی پڑھی، اور قدیم ہندوانہ حساب سیکھا جس کے وہ بڑے ماہر تھے، ان کو اس سے بڑی چڑھ تھی کہ کوئی شخص کاغذ، قلم دوات اور پنسل سے حساب لگائے، وہ ہر چیز کا حساب زبانی کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اس دیہاتی سادہ تعلیم سے کوئی سرکاری اور قومی ملازمت نہیں مل سکتی تھی اس لئے وہ اپنے قدیم پیشۂ زراعت و تجارت میں مشغول رہے، اس لئے اس مختصر تعلیم کے بعد بھی ہمارا خاندان ملازمت سے ناآشنا رہا، میرے چچا نے جو میرے دادا کے بھائی کی اولاد تھے، تعلیم میں اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور غالباً شرح جامی تک عربی پڑھی، اور چونکہ اہل حدیث تھے اس لئے حدیثوں کے شرح و ترجمہ سے اپنی استعداد زیادہ بڑھالی اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے لکھنے لگے، جن کے قلمی مسودات اب تک موجود ہیں، اس طرح رفتہ رفتہ ہمارا خاندان علم سے آشنا ہوا اور یہ آشنائی فارسی اور عربی زبان کے ذریعہ سے ہوئی جس کا اس زمانہ میں بڑا چرچا تھا، اس لئے میرے والد نے میری تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا، خود تو دو دو کوس کے فاصلے پر جا جا کر دوسرے گانوں کے مکاتب میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن

میرے لئے باقاعدہ اپنے دروازہ پر ایک مکتب قائم کیا اور ایک فارسی خواں معلم کو میری تعلیم کے لئے مقرر کیا، جس کو ہمارے یہاں سے دو روپیہ ماہوار تنخواہ اور کھانا ملتا تھا، اس کے علاوہ گانوں اور آس پاس کے دیہاتوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور دو دو چار چار آنے ماہوار دیتے تھے، اس طرح میرے گانوں اور آس پاس کے دیہاتوں کے بہت سے لوگ خواندہ ہوگئے، اور مجھے مسرت ہے کہ میری وجہ سے اس زمانے میں ابتدائی تعلیم کی تھوڑی سی اشاعت ہوگئی اور اس حیثیت سے میں یوم خواندگی منانے والوں سے اپنے آپ کو زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہوں، غرض میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں بجائے کسی عالم دین کے ایک ایسے معلم سے پڑھیں جس کو اس زمانے کی اصطلاح کے موافق ہم لوگ میاں صاحب کہتے تھے، میں بذات خود اس زمانے میں نصاب تعلیم کے لفظ سے ناآشنا تھا، البتہ اس زمانے کے رواج کے مطابق میں نے آمدنامہ، صفوۃ المصادر، کریما، مامقیماں اللہ خدائی، بوستان گلستان، اخلاق محسنی اپنے میاں صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد ان کا سرمایۂ علم ختم ہوگیا اور ان سے بہتر معلم کی تلاش ہوئی، اس وقت میرا سن تیرہ، چودہ سال کا تھا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق میری شادی اسی سن میں ہوگئی تھی خوش قسمتی سے میرے خسر صاحب ایک سند یافتہ عالم تھے، اور مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے تمام درسی کتابیں پڑھی تھیں، انھوں نے مختلف مقامات پر درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی تھی، لیکن اس وقت بیکار تھے اور خود اپنے

دروازہ پر ایک مکتب قائم کر کے حسبتہً للہ اپنے گاؤں اور اپنے خاندان کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے، اس بیچ میں نے دو برس تک اپنی سسرال میں رہ کر ان سے فارسی کی انتہائی کتابیں مثلاً انوار سہیلی، سکندر نامہ، بہار دانش، مینا بازار، شبنم شاداب، دیوان غنی اور دیوان ہلالی وغیرہ پڑھیں، اس کے بعد عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، اگرچہ میں خود اپنی سسرال میں رہ کر اپنے خسر سے عربی تعلیم حاصل کر سکتا تھا تاہم گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کے بعض ذرائع پیدا ہو گئے، میرے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی، اے، کانپور کے مشن کالج میں ایف، اے کلاس میں پڑھتے تھے اس وقت کانپور عربی تعلیم کا مرکز تھا، اور جامع العلوم اور فیض عام کی شہرت مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا احمد حسن صاحب کی ذات کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، میں یا میرے والد تو بذات خود کانپور کی اس علمی مرکزیت سے ناواقف تھے، البتہ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کے ساتھ کی وجہ سے میرے والد نے مجھ کو ان کے ہمراہ کر دیا، لیکن میں نے بذات خود کانپور کے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں حاصل کی، بلکہ خود ہمارے ہم وطن مولوی بخشش احمد صاحب جو اس وقت مدرسۂ اصلاح المسلمین سرائے میر میں مدرس ہیں کانپور مشن اسکول میں مدرس تھے اور مولوی محبوب الرحمٰن کے ساتھ رہتے تھے، میں نے عربی کی کتابیں مثلاً میزان الصرف، زبدہ، پنج گنج، صرف میر، نحو میر، ہدایۃ النحو، قال اقول، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، شرح تہذیب وغیرہ ان سے اور فیض عام اور جامع العلوم کے بعض فارغ التحصیل طلبہ سے پڑھیں، اور جو کتاب پڑھی پوری پڑھی اور

بعض کتابوں کو از بر یاد کیا، لیکن ایف، اے پاس کرنے کے بعد مولوی محبوب الرحمٰن صاحب آگرہ سینٹ جانس کالج میں داخل ہو گئے، اور میں بھی اُن کے ساتھ گیا، آگرہ کی جامع مسجد میں ایک برائے نام عربی کا مدرسہ قائم تھا، اور مولوی محمد رمضان مدرس تھے، میں نے اُن سے کافیہ، شرح جامی اور قدوری وغیرہ پڑھیں، اس کے بعد مولوی محبوب الرحمٰن صاحب بی، اے پاس کر کے علی گڑھ چلے گئے، اور میں نے غازی پور کا رخ کیا، جہاں مدرسہ چشمۂ رحمت مدت سے قائم تھا، اور اعظم گڑھ کے عربی خواں طلبہ کا قرب مسافت کی وجہ سے سب سے بڑا مرکز تھا، خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے عزیز و برادر محترم مولوی شبلی صاحب جو اس وقت دار العلوم ندوہ کے فقیہ ہیں مدرسۂ چشمۂ رحمت میں مدرس تھے، میں نے اُن سے قطبی، میر قطبی، شرح وقایہ، میبذی، نور الانوار، ہدیہ سعیدیہ اور ملا حسن وغیرہ پڑھیں اور ہر کتاب پوری پڑھی، اور میں نے اپنے اساتذہ میں ان کو سب سے بہتر پایا لیکن اس وقت بھی میں مدرسہ میں داخل نہ تھا بلکہ ان سے گھر پر پڑھتا تھا، ان کے علاوہ چشمۂ رحمت میں ہمارے ضلع کے ایک اور عالم مولوی لعل محمد صاحب مدرس اول تھے، ان کے اسباق میں بے قاعدہ شریک ہوتا رہا اور اسی طرح میرزاہد وغیرہ کے جستہ جستہ مقامات سُنے، ان واقعات سے معلوم ہوا ہوگا کہ میری تعلیم مدرسہ کی چار دیواری سے باہر قدیم طرز پر ہوئی، اور اب بھی میں خانگی تعلیم کو مدرسوں کی تعلیم سے بہتر سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک کتابوں کے انتخابات کا درس تعلیمی قابلیت کے لئے سم قاتل ہے، ہر کتاب پوری پڑھنا چاہیئے۔

کانپور، آگرہ اور غازی پور میں تعلیمی سلسلے کے علاوہ کچھ ادبی مشاغل بھی جاری تھے، ہمارے عزیز مولوی محبوب الرحمان کلیم شاعر تھے، اس لئے ان کی صحبت میں رہ کر میں نے بھی شاعری شروع کی اور اُن ہی کے تخلص کی مناسبت سے شمیم تخلص اختیار کیا، اس وقت پیام یار، پیام عاشق اور دامن گلچیں وغیرہ متعدد شاعرانہ رسالے نکلتے تھے جن میں بہت سے شعراء کی ہم طرح منتخب غزلیں شائع ہوتی تھیں، میں ان رسالوں کو بہ شوق پڑھتا تھا، اور اُن میں اپنی غزلیں اشاعت کے لئے بھیجتا تھا، پہلے مولوی محبوب الرحمٰن سے اصلاح لیتا تھا، غازی پور آیا تو مدرسہ چشمۂ رحمت کے منیجر اور غازی پور کے سب سے بڑے شاعر مولوی عبدالاحد شمشاد منیجر مدرسہ چشمۂ رحمت سے اصلاح لینے لگا، مولوی عبدالاحد صاحب شمشاد نے فارسی اور اُردو کی کتابوں کا ایک بڑا کتب خانہ بھی جمع کیا تھا اور طلبہ اور اپنے تلامذہ کو نہایت فیاضی کے ساتھ کتابیں دیکھنے کو دیتے تھے، اور میں اُن کے یہاں سے اردو اور فارسی کے دواوین لاکر بہ شوق ان کا مطالعہ کرتا تھا، اس وقت تک تو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری محسن کتابیں کون کون سی ہیں ؟ یا یہ کہ مجھ کو کسی زمانے میں اس موضوع پر لکھنے کی تکلیف و دعوت دی جائے گی، لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری محسن کتابیں سکندر نامہ دیوان غنی، دیوان ہلالی اور اخلاق محسنی وغیرہ تھیں، کیونکہ فارسی دواوین کے سمجھنے میں مجھے ان سے بڑی مدد ملی اور شاعرانہ تلمیحات، تشبیہات، استعارات اور صنائع و بدائع کے سمجھنے اور اُن سے لطف اُٹھانے میں انھوں نے میرے ساتھ خاموش احسان کیا،

اس وقت تک میں نے نثر کی کتابوں کا بہت کم مطالعہ کیا تھا، لیکن میرے عزیز مولوی محبوب الرحمٰن کلیم مضمون نگار بھی تھے، اور اُن کی صحبت میں سرسید، مولانا حالی، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ کا نام اکثر سنتا رہتا تھا اور مولانا شبلی مرحوم تو ہمارے ہم وطن ہی تھے ان سے میں پہلے ہی سے واقف تھا اور اُن کی شکل و صورت دیکھنے کا مشتاق تھا، خوش قسمتی سے کانپور میں ان کی صورت دیکھی اور ان کی ایک مختصر سی تقریر بھی سنی، لیکن اب تک میں نے ان ادبائے ہند کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن جب آگرہ میں تھا تو اُسی زمانہ میں الفاروق نکلی اور آگرہ اخبار کے اڈیٹر نے مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کو ریویو لکھنے کی غرض سے وہ کتاب دی وہ اس کو گھر لائے تو میں نے اس کو بغور پڑھا اور یہ پہلا دن تھا کہ دورِ جدید کی تصنیفات میں ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور ادیب کی ایک ممتاز تصنیف میری نظر سے گزری اسی زمانہ میں رسائل شبلی کا مجموعہ بھی شائع ہوا اور میں نے اس کو بھی بہ شوق پڑھا اس کے بعد مجھے ایک عجیب قسم کی بدقسمتی سے خود عربی زبان کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا، ہندوستان میں طاعون نمودار ہوا اور ہر جگہ شدت کے ساتھ پھیلا، میں طاعون کے خوف سے سلسلۂ تعلیم کو چھوڑ کر گھر پر بیٹھ گیا، لیکن یہ بیکاری میرے لئے مفید ثابت ہوئی، اعزہ و اقارب میں چند لوگ عالم تھے، اور کچھ کتابیں جن میں زیادہ تر حصہ درسی کتابوں کا تھا جمع کرلی تھیں میں ان کے اس مختصر کتب خانہ سے منطق و فلسفہ کی کتابیں مثلاً شرح مطالع، ملا جلال حمداللہ میر زاہد امور عامہ وغیرہ مانگ لاتا تھا اور ان کا تفریحاً مطالعہ کرتا تھا زیادہ تر کتابوں پر

مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حاشیے ہوتے تھے، اور وہ اپنے تبحر علمی اور طرز تحریر سے مطالب کو نہایت آسان کر دیتے تھے اس لئے میں ان کتابوں کو بہت اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، اسی زمانہ میں تفسیر کبیر بھی پوری پڑھ ڈالی اور چونکہ امام رازی بھی پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان عبارت میں لکھتے ہیں اس لئے اس کو بھی میں بہ آسانی سمجھ جاتا تھا، ان کتابوں کے مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر اور یہ احسان ہوا کہ مجھ کو عقلیات سے دلچسپی ہوگئی، اور صرف وہی کتابیں پسند آنے لگیں جو عقلی اصول کے مطابق لکھی گئی ہوں یعنی دعوے، دلیل اور علل واسباب سب پر بحث ہو، میرا یہ ذوق اب تک قائم ہے، اور تاریخی، ادبی مذہبی ہر کتاب میں ان چیزوں کی جستجو کرتا ہوں۔

دو برس میں طاعون کا خوف کم ہوا اور اپنی تضییع اوقات پر افسوس ہونے لگا تو ندوہ میں چونکہ زیادہ تر اپنے ہم وطن لوگ رہتے تھے، بالخصوص اعلیٰ عہدہ دار مثلاً مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم اور مولانا شبلی نعمانی معتمد دارالعلوم اپنے وطن اور برادری کے لوگ تھے بس لئے دارالعلوم ندوہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، مولانا حفیظ اللہ صاحب کو خط لکھا اور انھوں نے نہایت مہربانی کے ساتھ بلا لیا، وہاں پہونچ کر پانچویں درجہ میں داخل ہوا، اگرچہ مولانا شبلی کے آنے کے بعد نصاب تعلیم بدل گیا تھا تاہم پانچویں درجہ سے لے کر آٹھویں درجہ تک جو کتابیں داخل درس تھیں وہ میرے عقلی اور ادبی ذوق کے بالکل مطابق تھیں، شرح حکمۃ العین، شرح حکمۃ الاشراق، توضیح تلویح، ہدایہ، حماسہ، سبعہ معلقہ، متنبی، نقد الشعر، دلائل الاعجاز وغیرہ میرے عقلی اور ادبی

معیار پر پوری اُتریں، اس لیے میں نے ان کو بہ شوق پڑھا، کبھی کبھی مولانا حفیظ اللہ صاحب، کی قدیم تعلیمی عصبلیت میں ہیجان پیدا ہوجاتا تھا تو حمد اللہ، قاضی مبارک اور صدرا کے اسباق بھی ہوجاتے تھے، ان کتابوں کے اثر سے عقلی اور ادبی ذوق میں اور ترقی ہوئی اور کتب خانے سے شرح مقاصد، شرح مواقف اور شرح تجرید وغیرہ مستعار لے کر بالاستیعاب مطالعہ کرنے لگا، اُردو کتابوں میں اس زمانہ میں مولانا شبلی کی علم الکلام اور الکلام شائع ہوچکی تھیں، چونکہ یہ دونوں کتابیں عقلی اصول پر لکھی گئی تھیں اس لیے میں نے نہایت شوق سے ان کو پڑھا، مجھے غلط یا صحیح طور پر طرز تحریر میں مولانا شبلی کا مقلد کامل خیال کیا جاتا ہے غالباً ان کی تصنیفات کے ابتدائی مطالعہ کا یہ احسان ہوگا، بہر حال میں ان کی تصنیفات کو اپنا محسن اور اپنا رہبر سمجھتا ہوں، مولانا شبلی کے علاوہ اور مصنفین کی کتابیں مجھے بالکل پسند نہ آئیں، مولانا نذیر احمد اور مولانا عبدالحلیم شرر کی تصنیفات کو تو میں نے بالکل ناپسند کیا، سرسید کی تصنیفات کا معیار بھی میرے نزدیک بلند نہیں، اُردو طرز تحریر پر اُن کا یہ احسان ضرور ہے کہ انھوں نے قدیم مقفیٰ اور طرز تحریر کو چھوڑ کر ایک سادہ سلیس اور رواں طرز تحریر پیدا کیا، لیکن میرے نزدیک ان کی انشا پردازی میں رنگینی اور بانکپن نہیں۔ مضامین بھی زیادہ تر مناظرانہ اور ملایانہ ہیں، بعض مقامات پر ابتذال اور بھدا پن بھی ہے، بہر حال مجھ پر ان کی تصنیفات کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا، مولانا حالی میں بھی وہ نوک جھونک رنگینی اور بلندی نہیں البتہ وہ نقاد بہت بڑے ہیں اور ان کی تصنیفات میں مقدمۂ شعر و شاعری، حیات سعدی

اور یادگارِ غالب کا مجھ پر اس حیثیت سے خاص طور پر احسان ہے اور میں تنقیدی حیثیت سے اُن کی ان کتابوں کو اپنا محسن اور رہنما سمجھتا ہوں، میں نے ناول بہت کم پڑھے ہیں البتہ ہر دوئی کے حکیم محمد علی کے چند ناول پڑھے تو اُن کی رنگین بیانی کا مجھ پر خاص اثر ہوا، مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کو اگرچہ میں پسند کرتا ہوں لیکن ان کی تصنیفات کو بہت زیادہ بلند پایہ متین اور سنجیدہ نہیں سمجھتا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیفات میں مجھ کو فلسفۂ اجتماع، فلسفۂ جذبات، تاریخ اخلاق یورپ باعتبار مضامین اور باعتبار طرزِ تحریر کے بہت زیادہ پسند ہیں، یہ کتابیں مادہ اور صورت دونوں کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تصنیفات کا مکمل عکس ہیں اسی لئے ہم اور وہ دونوں ایک ہی چراغ کے پروانے ہیں، روحانی اور ادبی حیثیت سے مجھ پر صحیح بخاری کا نہایت عمدہ اثر ہوا لیکن اسی نسبت سے میں فقہی کتابوں کو بالکل بے اثر اور بے کیف پاتا ہوں۔



از جناب خواجہ غلام السیدین صاحب وزیر تعلیم ریاست رامپور

جہاں تک یاد پڑتا ہے مجھے ۱۹۱۲ء سے مطالعہ کا باقاعدہ شوق پڑا۔ میں اُس وقت پانی پت کے میونسپل اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں بسر کرنے کے لئے میرٹھ گیا تھا، جہاں میرے والد خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم اُس زمانہ میں وکالت کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے اپنے کتب خانہ کی ایک مکمل فہرست تیار کرنے کی فرمائش کی اور میں نے بہت خوشی سے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ ان کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی کتابیں تھیں۔ مذہب، فلسفہ، منطق، تاریخ، فقہ، ناول، ادب، قانون، معاشیات، غرض ہر قسم کی کتابیں انھوں نے جمع کی تھیں اور اُن کا بہت غور اور شوق کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ ان کو علاوہ اُردو اور فارسی کے عربی اور انگریزی پر بھی غیر معمولی عبور تھا۔ اور وہ ان تمام زبانوں میں بے تکلف تحریر اور تقریر کر سکتے تھے۔ میری ملاقات اور واقفیت خاصی وسیع ہے لیکن میں کسی اور شخص سے واقف نہیں جس کا مطالعہ ان جیسا وسیع اور متنوع ہو اور جس نے اس قدر مختلف علوم میں ایسی بصیرانہ نظر پیدا کی ہو۔ خیر یہ احساس تو مجھے بعد میں ہوا جب میں نے ان کے انتقال کے بعد ان کی تصانیف اور مضامین کو پڑھا اور ان کے ہمعصروں سے ان کی ذہانت اور وسعت معلومات کی داستانیں سُنیں۔ اُس وقت تو مجھے صرف اس بات پر تعجب ہوا کہ انھیں اس قدر مختلف علوم میں کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

بہرحال میں نے لائبریری کی فہرست تیار کرنی شروع کی، لیکن کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ مُنھ کالے ہونے ضروری ہیں! رجسٹر میں کتابوں کے نام درج کرنے اور ان پر کاغذ کی چٹیں لگانے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں، بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ میں گھنٹوں بجائے اپنا مفوضہ کام کرنے کے اپنا وقت کتابوں کے پڑھنے میں "ضائع" کرتا۔ والد مرحوم نے بہت دفعہ اس "تضیع اوقات" کو دیکھا، لیکن کبھی اس پر نہیں ٹوکا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اس طرح مطالعہ کا سچا شوق پیدا ہو جائے تو وہ عمر بھر انسان کے لئے ایک بہترین رفیق ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ بعض والدین اور استادوں کی طرح ہمدردی اور تخیل سے محروم ہوتے اور بچوں کی نفسیات سے واقف نہ ہوتے تو یقیناً مجھے ٹوک دیتے اور میری ذہنی دلچسپیوں کی دنیا ہی مختلف ہوتی، لیکن انھوں نے بڑی محبت اور دوراندیشی کے ساتھ میری ہمت افزائی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے دو ماہ میں ہزاروں کتابوں کی فہرست تیار کی اور ہزاروں صفحے پڑھ ڈالے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس وقت جتنا کچھ پڑھا وہ سب سمجھا نہیں لیکن اس تجربہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ روانی اور تیزی کے ساتھ پڑھنے کی عادت پیدا ہو گئی اور میں بجائے ہونٹوں سے اور بہ آواز بلند پڑھنے کے آنکھوں سے پڑھنے لگا جو خاموش مطالعہ کے لئے ایک شرط لازم ہے۔

یہ تو میرا بچپن کا زمانہ تھا لیکن اس کے چند سال بعد مجھے کئی سال تک، اپنے عم محترم مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی

ساری زندگی علم اور مذہب کے دائرے میں محدود تھی۔ دنیا کے معمولی کاروبار ان کے لیے ایک قسم کی کوفت کا باعث ہوتے تھے۔ ان کو حقیقی مسرت صرف علمی اور مذہبی کاموں میں، وعظ و تقریر میں، تحریر و تصنیف میں حاصل ہوتی تھی۔ ان کا مطالعہ اس قدر وسیع اور متنوع تو نہ تھا جس قدر والد مرحوم کا، لیکن اپنی دلچسپی کے خاص مضامین کا انھوں نے غیر معمولی محنت، استقلال اور دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ قرآن شریف پر انھیں کمال کا عبور تھا اور اس کے مطالب ہر وقت ان کی زندگی اور ان کی تحریر و تقریر میں جاری اور ساری رہتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص ان کی صحبت میں رہے اور قرآن شریف کی عظمت کا قائل نہ ہو جائے۔ اور یہ احساس عظمت بھی محض اعتقادی اور نظری نہ ہوتا تھا بلکہ عملی ہوتا تھا۔ وہ بھی ان کی طرح قرآن شریف کو زندگی کے لیے ایک شمع ہدایت سمجھتا اور اپنے اعمال و افکار کا سرچشمہ اسی میں تلاش کرتا۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ان کی صحبت میں مجھے قرآن شریف کے اتھاہ خزانوں پر عبور حاصل ہو گیا، لیکن ان کے طفیل میرے دل پر اس کی عظمت کا نقش بیٹھ گیا اور میں نے اتنی عربی سیکھ لی کہ اس کا مطلب نکال سکوں۔ انھیں کی بدولت مجھے یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ قرآن کو محض "برکت" حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لینا جس کے الفاظ کو پڑھ کر انسان داخل ثواب ہو جاتا ہے غلط ہے اس کو مذہبی اعتقادات کا مجموعہ سمجھ لینا بھی کافی نہیں، بلکہ ضرورت یہ ہے کہ اس کے عظیم الشان اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کو زندگی کے ہنگامہ خیز مسائل کے حل

کرنے میں استعمال کیا جائے۔ مذہب کے بارے میں یہ عملی نقطۂ نظر جو شاید ابتدا میں غیر شعوری طور پر قائم ہوا ہو ہمیشہ میرے مطالعہ اور غور و فکر پر نظر انداز رہا ہے ان کے فیض صحبت سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ علم اور مذہب اور فکر انسانی کی دنیا اس مادّی دنیا سے جہاں محض معاش کے لئے مسلسل جدّوجہد ہوتی رہتی ہی کم رقیع اور کم حقیقی نہیں بلکہ زیادہ اہمیت اور معنویت رکھتی ہے۔

چونکہ ابتدا میں اتفاق سے قرآن شریف کا ذکر آگیا ہے اس لئے میں اسی سلسلہ میں چند مذہبی کتابوں کا اور ذکر کر دوں تو مناسب ہوگا۔ میں نے مذہبی کتابیں زیادہ نہیں پڑھیں اور میرا خیال ہے کہ خالص فقہی اور مذہبی مسائل کی کتابیں جن میں بعض اوقات جزوی تفصیلات حقیقت کے روشن چہرے کو چھپا لیتی ہیں عام لوگوں کے لئے چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کا مطالعہ صرف ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو فقہ یا مذہب کو اپنا مخصوص موضوع بنانا اور ان میں تحقیق اور تجسّس کرنا چاہیں، عام لوگوں کے لئے مذہب کے بڑے بڑے اصولوں سے واقف ہونا اور اُن کو عام تجربے اور معلومات کی روشنی میں پرکھنا زیادہ مفید ہے۔ قرآن شریف کی تفسیروں اور ترجموں میں سے میں نے چند کو پڑھ لیا ہے لیکن ان سب میں مقابلۃً مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن نے مجھے زیادہ متاثر کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے قرآن شریف کی تعلیم کو اصطلاحی اور فقہی نقطۂ نظر سے پیش نہیں کیا بلکہ اس کے وسیع تر مطالب کو بھی واضح کیا ہے، اور زندگی کے بعض اہم مسائل سے اس کا تعلق دکھایا ہے

کاش انھیں اتنا موقع اور فرصت ملے کہ وہ اس ترجمے کو مکمل کر سکیں۔

ایک اور کتاب جس نے مجھ پر کافی اثر کیا ہے علامہ عبد العلی صاحب ہروی کی "موعظہ حسنہ" ہے یہ علامہ مرحوم کی دس بارہ تقریروں کا ترجمہ ہے جسے مولوی محمد سبطین صاحب لدھیانوی نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ غالباً بہت سے حضرات علامہ مرحوم کے نام اور شہرت سے واقف نہ ہوں گے۔ علامہ عبد العلی مرحوم شاید ۱۹۰۳ء میں ایران کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اس زمانے میں والد مرحوم مالیر کوٹلہ میں جج تھے۔ اور وہیں اُن کی ملاقات علامہ موصوف سے ہوئی۔ والد مرحوم کو "پیشہ ور" مولویوں کے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہ تھی، وہ محض خوش عقیدگی کی بنا پر ہر مولوی نما شخص کے قائل نہ ہو جاتے تھے۔ لیکن انھیں کئی ماہ تک مسلسل علامہ موصوف کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے اُن سے نہ صرف مذہب اور فلسفۂ قدیم پر بلکہ علوم جدید پر بھی لمبی لمبی بحثیں کیں اور یہ اندازہ لگایا کہ وہ واقعتاً ایک زبردست اور متبحر عالم ہیں، جنھوں نے دقت نظر سے مذہب کا اور علوم جدیدہ کا مطالعہ کر کے درجۂ اجتہاد حاصل کیا ہے یعنی انھیں اپنی علمی قابلیت اور جدت فکر کی بدولت یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی مسائل میں اجتہاد کر سکیں، اس وقت سے والد مرحوم ان کے بہت قائل ہو گئے۔ اور اکثر جب وہ کسی جلسے میں تقریر کرتے تھے تو والد مرحوم اس کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں فی البدیہہ بیان کر دیتے تھے۔ یہ خدمت بعض اوقات مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم اور مولوی محمد سبطین

صاحب بھی انجام دیتے تھے اور یہ تینوں حضرات اُن کی پُر مغز اور بصیرت افروز تقریروں اور ان کی ذہنی جودت کے بہت مدّاح تھے ۔میں نے بھی ان کی بعض شگفتہ فارسی تقریریں سُنی ہیں، مُنھ سے پھول جھڑتے تھے ۔جی چاہتا تھا کہ " وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی" مواعظ حسنہ میں اُن کی جو تقریریں شائع ہوئی ہیں وہ دراصل مجالس عزا کے موقع پر کی گئی تھیں اور ان سب کے آخر میں سید الشہدا علیہ السلام کی شہادت کا بیان ہے ۔لیکن ہر تقریر میں قرآن شریف کے مطالب اور اسلامی اخلاق کے اصولوں کو اس قدر عمدگی اور ندرت خیال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کو پڑھ کر اسلام کے بلند تصور حیات کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے ۔کچھ تو ان کی غیر معمولی طور پر جاذب شخصیت کا سحر ہو گا اور کچھ ان تقریروں کی خوبی، بہر حال جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تھا تو مجھ پر اس کا بہت کافی اثر پڑا تھا ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ روح اسلام کی سب سے بہتر تفسیر میں نے علامہ اقبال کی شاعری اور تصانیف میں پائی ۔بہ حیثیت شاعر کے میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں اور بعض اعتبار سے انھیں اُردو زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں ۔میں ان کی ذہانت اور قوت فکر کا بہت قائل ہوں ۔مغربی تہذیب کی جو جامع تنقید انھوں نے کی ہے اُس کا میری نظر میں بہت بلند علمی مرتبہ ہے ۔مگر ان کی شاعری کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس نے اسلام کا ایک زندہ تصور میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس حقیقت سے روشناس کیا کہ مذہب گوشہ گیری یا محض ریاضت و عبادت کا نام نہیں

بلکہ وہ بعض بنیادی اصولوں کے ماتحت زندگی کی تنظیم کی تعلیم دیتا ہے، اور اس کے بے اندازہ امکانات کو ظہور میں لانے کے لئے جد و جہد کرنا سکھاتا ہے ۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

یہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست — وہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔

اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید — جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اقبال کے کلام نے مجھے زندگی کے ایک نئے حرکت آفریں تصور سے روشناس کیا اور دین اور دنیا کا حقیقی تعلق سمجھایا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دور حاضر کی ترقی اور سائنس کے کمالات اور معجزات کن شرائط کے اندر خدا کی نعمت ہیں اور کب عذاب الٰہی بن جاتے ہیں۔ دیکھئے دین اور دنیا کے تعلق پر کس قدر انوکھے لیکن فیصلہ کن انداز میں روشنی ڈالی ہے

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود — بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

یعنی جو شخص یا جو قوم اپنی دنیاوی زندگی کو نہ سنوار سکے اور اس میں حسن اور عظمت کی شان پیدا نہ کر سکے اس کا دین داری اور عبادت گزاری کا دعوے کرنا یا تو خود فریبی ہے یا عالم فریبی۔ جو جماعت خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لیتی ہے اس کو

رئیل صراط پر سے گزرنے میں مشکل ہونی چاہیے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ نہ سیاسی اور معاشرتی الجھنوں کو سلجھانے میں لیکن ان مشکلات سے عقل بغیر عشق کی روشنی اور سوز کے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی عقل چراغ راہ ہے، لیکن "عشق" (جس میں عشق الٰہی اور انسانوں کی پرخلوص خدمت کا ولولہ دونوں شامل ہیں) منزل کا تعین کرتا ہے اور مذہب ان دونوں میں توازن قائم رکھتا ہے۔ جب عقل وعشق کا یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، جب عقل بے زمام ہوجاتی ہے اور مذہب کی تابع نہیں رہتی تو انسانی تہذیب، ظلم، ناانصافی اور تخریب کے دلدل میں پھنس کر تباہ ہونے لگتی ہے جیسا کہ آج کل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے "دورِ حاضر کے انسان" کے عنوان سے اقبال نے اسی الم ناک صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال کی بعض نہایت اثر آفریں نظمیں اس کے پہلے مجموعے "بانگ درا" میں شامل ہیں اس کے فارسی کلام کا سرور انگیز شباب "پیامِ مشرق" میں پایا جاتا ہے، لیکن میرے خیال میں اس کے تصورِ حیات کی تفسیر کے لئے ان دونوں مجموعوں سے زیادہ اہم اس کی مثنویاں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" "جاوید نامہ" اور دو آخری اردو مجموعے

"بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" ہیں محض فنی اعتبار سے ضربِ کلیم میں وہ خوبیاں نہیں جو بالِ جبریل یا بانگِ درا کی بعض نظموں میں ہیں۔ کیونکہ اس مجموعہ میں فکر آرٹ پر غالب آگیا ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان بعد کی نظموں میں اقبال محض وطنی اور قومی بلکہ اسلامی شاعری کی منزل سے بھی گزر کر عالمِ انسانیت کا شاعر بن گیا ہے اور دنیا کے سامنے بالعموم اور مسلمانوں کے سامنے بالخصوص وہ زندگی کا ایک ایسا بلند نصب العین پیش کرتا ہے جس سے رگوں میں خون تیز ہو جاتا ہے اور انسان کے غیر محدود امکانات کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ بالِ جبریل میں اس کا ساقی نامہ پڑھیے جس میں ان امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اقبال کے علاوہ دو اور شاعر ایسے ہیں جن کا اثر یقیناً میرے خیالات اور

جذبات پر پڑا ہے ایک حالیؔ اور دوسرے انیسؔ۔ حالیؔ کی مسدس دُنیائے ادب کی متاثر ترین تصانیف میں سے ہے۔ اس کو میں نے اپنی عمر کی مختلف منزلوں میں پڑھا ہے اور عجیب بات ہے کہ جب کبھی میں نے اس کو چند ماہ یا چند سال بعد از سرِنو پڑھا ہے اس کی ادبی اور فکری عظمت کا احساس اور گہرا ہو گیا ہے۔ مسدس حالی کے معتقدوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے لیکن مختلف لوگوں پر اس کا اثر مختلف وجوہ سے ہوا ہے۔ بعض نے اس کا خیر مقدم اس اعتبار سے کیا کہ یہ جدید شاعری کی پہلی اہم تصنیف ہے۔ بعض کے دل پر مسلمانوں کے زوال کی داستان کی گہری چوٹ لگی۔ لیکن مجھے اس کے جس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اس کی سلامتی فکر اور دقتِ نظر ہے۔ مسدس حالی محض ایک بیانیہ تاریخی نظم نہیں بلکہ یہ تاریخ کے ایک اہم دور کی نفسیاتی اور فلسفیانہ تفسیر کرتی ہے۔ حالیؔ نے غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے ساتھ مسلمانوں کے عروج اور زوال کے اسباب بیان کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اگر اس زمانے میں مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو اپنے میں کون سی انفرادی اور اجتماعی صفات اور عادتیں پیدا کرنی چاہئیں' قوم کے مرض کے لئے نسخہ لکھنے میں حالیؔ نے اپنا ذہنی توازن ایک ایسے نازک اور پُرآشوب دور میں بھی قائم رکھا جب مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم نے تقریباً سب لوگوں کے توازن اور نظامِ اقدار کو درہم برہم کر دیا تھا۔ بعض لوگ ہر مغربی چیز کو بُرا سمجھتے اور اس کے استعمال کو کفر قرار دیتے تھے۔ بعض لوگ آنکھیں بند کر کے

تمام مغربی رسوم و رواج اور اداروں کو اختیار کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن حالی نے قدیم و جدید مشرق و مغرب کے مطالبات کو ایک صحیح کسوٹی پر پرکھا اور اُن تمام چیزوں کو مسترد کیا جو قومی ترقی کے راستے میں حائل تھیں یا محض اپنی ظاہری چمک سے کم سمجھ لوگوں کی نگاہ کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ مگر اس نے فراخ دلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ان تمام چیزوں کا خیر مقدم کیا جو زوال پذیر ہندوستانیوں کی بجھی ہوئی زندگی میں شرر پیدا کر سکتی تھیں۔ مسدس حالی میں کیا کچھ نہیں ہے؟ محنت کی عظمت کا اعتراف ہے، بیکاری اور کاہلی کی مذمت ہے، دولت مندوں کے مظالم اور اسراف، غریبوں کی کم ہمتی، مذہبی پیشواؤں کی بے راہ روی اور اہل سیاست کے تعصب اور تنگ نظری پر احتساب ہے، جھوٹی اور اوچھی شرافت کی پردہ دری ہے، مزدوروں اور کسانوں اور محنت کشوں کی ہمدردی ہے۔ غرض وہ تمام چیزیں جو ایک معقول اور با انصاف نظام معاشرت کو قائم کرنے کے لئے یا افراد کی سیرت کی صحیح تشکیل کے لئے ضروری ہیں حالی کے یہاں موجود ہیں۔ اور اگر میں کسی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری Sense of value یعنی چیزوں کی اضافی قدر و قیمت کے متعلق میرا اندازہ صحیح اور مناسب ہے تو اس کو زیادہ تر مسدس حالی کے مطالعہ کا تصدق سمجھنا چاہیے اور حالی کے خیالات کی اس تفسیر کا جو میرے عم محترم جناب خواجہ غلام السطین صاحب مدظلہ، نے اپنی تعلیم اور اپنی مثال کے ذریعہ کی ہے۔

دوسرا شاعر جس نے مجھے متأثر کیا ہے، انیس ہے۔ انیس کو قدرت سے دو

غیر معمولی عطیے ملے۔ ایک تو شعر گوئی کا ایسا ملکہ جو اعجاز کی حد تک پہونچتا ہے اور دوسرے ایسے موضوع کا انتخاب جس میں درد اور اثر آفرینی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یعنی کربلا کا واقعہ اور سید الشہدا حضرت امام حسین کی ذات مبارک۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی، شرافت، جرأت، انسانی دوستی اور خدا ترسی کے جو جیتے جاگتے نقشے کھینچے ہیں اور ان محبوب شخصیتوں کی سیرت نگاری میں جس سوز اور خلوص اور فنی قابلیت سے کام لیا ہے اس سے متاثر نہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ انیس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انسان جو اس قدر کمزور بھی ہے اور ظالم ہے، جو اکثر خود اپنی اسفل فطرت کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے، جو اپنے چھوٹے چھوٹے اور گھٹیا مقاصد کے لئے اخلاق اور مروّت اور اصول پرستی کا خون کرنے سے نہیں چوکتا اور بے تکلف دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے، یہی انسان اخلاقی اور روحانی ترقی کے منازل طے کر کے اس بلند مقام تک پہونچ سکتا ہے جو انیس کے ہیرو اور انسانی تاریخ کے سب سے بڑے مجاہد اور شہید امام حسین کو حاصل ہے۔ جب زندگی کی تحریصیں اور اس کی آسائشیں یورش کرتی ہیں، جب دیانت اور ایمان کی ٹمٹاتی ہوئی روشنی بجھنے لگتی ہے، جب انسان حالات سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ اصول اور عدالت کے کٹھن راستے کو ترک کر کے عام لوگوں کے رنگ میں رنگ جائے اور ان کی آسان پسندی اختیار کر لے، اس وقت حسین ابن علیؑ کی مثال سامنے آ کر دستگیری کرتی ہے اور زندگی کے ایک بہتر لیکن دشوار گزار راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے

لوگوں کو ایسا تجربہ ہوا ہوگا اور اس تجربہ میں انیس کی شاعری کو بڑا دخل ہے جس نے واقعۂ کربلا کو لافانی شعر کے قالب میں ڈھال کر اس کی حقیقی اہمیت اور معنویت کو عام لوگوں تک پہونچایا ہے۔

میں نے اُردو کی بہت کافی کتابیں پڑھی ہیں اور اُن میں سے بعض یقیناً فنی اور فکری اعتبار سے بہت قابل قدر ہیں۔ مثلاً پریم چند کے ناول اور افسانے جن میں ہندوستانی زندگی کی نبض چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حالی کی "حیات جاوید" جس میں اُس نے اپنے ممدوح سر سید کی ہمہ گیر اور متنوع شخصیت کی ایک اَمِٹ تصویر کھینچی ہے (میرا خیال ہے کہ سوائے ٹیگور کے ہندوستان کے مشاہیر میں سے کسی اور کے حصے میں اتنی مختلف قسم کی صلاحیتیں اور قوتیں اس قدر فراوانی کے ساتھ نہیں آئیں) سرشار کا فسانۂ آزاد جس میں ایک بہت دلچسپ لیکن زوال پذیر تمدّنی دور کا نقشہ بڑی چابک دستی سے کھینچا گیا ہے، فرحت اللہ بیگ کے مضامین، ٹیگور کی بعض ادبی اور قومی تصانیف (یعنی اُن کے بُرے بھلے ترجمے) وغیرہ وغیرہ۔ جب میں نے ان کتابوں کو پڑھا تھا میں ان سے یقیناً متاثر ہوا تھا اور محسوس یا غیر محسوس طریقے پر انھوں نے بھی اور بہت سی کتابوں کی طرح میرے خیالات کی دنیا کو وسیع کرنے اور میری انسانی ہمدردی کو ہمہ گیر بنانے میں حصہ لیا۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے شعوری طور پر میرے خیالات اور جذبات کو ان کا مخصوص رنگ دیا ہے، اس لئے اس فہرست کو زیادہ لمبا کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ علاوہ اس کے بہت سی

کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھتا ہے، لیکن بعد میں ان کا مضمون بلکہ ان کا اور ان کے مصنف کا نام بھی یاد نہیں رہتا۔ لیکن ایسی کتابوں کے متعلق میرا ایک تسکین دہ نظریہ ہے جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ لیکن یہاں بہرحال صرف ان کتابوں کا تذکرہ مقصود ہے جن کا شعوری اثر خاص طور پر گہرا ہوا ہے۔ اس زمرہ میں شاید مندرجۂ بالا کتابیں کافی ہوں گی۔

نظامِ تعلیم کا "فیض" سمجھئے یا مقابلۃً ہماری زبان کی کم مائگی، مجھے اُردو کتابوں سے زیادہ انگریزی کتابوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انگریزی زبان میں ادب اور علوم کے اَن گنت اور انمول خزانے بھرے ہوئے ہیں اور ہم لوگوں کے لئے تو دوسری مغربی زبانوں اور ان کے ادب کی کنجی بھی انگریزی زبان ہی ہے کیونکہ اس میں بیشتر یورپی زبانوں کی مستند تصانیف کے ترجمے موجود ہیں۔ انگلستان اور ہندوستان کے سیاسی تعلق کی وجہ سے جہاں ہندوستان کی قومی زندگی اور ارتقا کو بہت کچھ نقصان پہونچا ہے اور انگریزی تعلیم کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم اور ہماری ملکی زبانوں کا حیات بخش رشتہ ٹوٹ گیا ہے، وہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انگریزی زبان اور ادب اور مغربی علوم کے مطالعہ نے ہماری نظر کو زیادہ وسیع اور بعض اعتبار سے ہمارے ذہنی ارتقا کو زیادہ تیز بنا دیا ہے۔ اگر ہماری سیاسی تاریخ مختلف ہوتی تو شاید ہم مغربی علوم تک کسی اور راستے سے پہونچتے۔ لیکن شاید مشیت الٰہی اسی طرح تھی!

جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس مضمون میں کون سی انگریزی کتابوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر کروں تو مجھے ایک مشکل پیش آتی ہے۔ کتابیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کا مفصل تذکرہ کرنا ناممکن اور صرف فہرست لکھ دینا بیکار ہے۔ علاوہ اس کے میرا خیال یہ ہے کہ بہت سی اچھی اور مفید کتابیں جو ہم پڑھتے ہیں ان کا نقش انفرادی حیثیت سے ہمارے دل اور دماغ پر قائم نہیں رہتا بلکہ بعض اوقات ہم ان کے مطالب کا خلاصہ، ان کا پلاٹ بلکہ ان کے مصنف کا نام تک بھول جاتے ہیں۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ ان کا مطالعہ بیکار گیا۔ دراصل اس کتاب کی جزوی تفصیلات محو ہو جاتی ہیں لیکن اس کی روح اس کے کرداروں کی سیرت، ان کی شرافت اور انسانیت اور اس کا مرکزی خیال ہمارے دل اور دماغ کی گہرائیوں میں جا پہونچتا ہے اور غیر شعوری طور پر ہمارے خیالات اور جذبات، ہمارے اعمال اور حرکات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ کوئی انسان کسی بڑے تخلیقی تجربے سے گزرنے کے بعد وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا۔ خواہ وہ تجربہ دکھ کا ہو یا سکھ کا، آرٹ کا ہو یا عشق و محبت کا یا مذہب کا یا سیاست کا، اس کی سیرت کے بنیادی عناصر میں ایک نیا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ کسی بلند پایہ مصنف یا کسی اعلےٰ درجہ کی کتاب کا مطالعہ اسی قسم کے تخلیقی تجربات میں سے ہے۔ اگر کوئی اچھی کتاب محض تفریح یا وقت گزارنے کے لئے نہیں پڑھی گئی ہے، اگر اس نے پڑھنے والے کے دل کے تاروں کو ہلایا ہے اور اس کے دل میں احساس، ہمدردی اور حسن شناسی کے

نئے جذبات کو ابھارا ہے تو وہ اس کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے اور اس کا پیغام اس کے خون کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میرے لئے فرداً فرداً کتابوں کا ذکر کرنے کے بجائے یہ بتانا زیادہ سہل ہوگا اور یہی شاید پڑھنے والوں کے لئے بھی زیادہ دلچسپی کا باعث ہو کہ کن مصنفوں نے میرے خیالات کو سب سے زیادہ متأثر کیا ہے اور کیوں؟

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مجھے سب سے زیادہ ادب عالیہ کے مستند ارکین نے متأثر کیا ہے۔ میں نے مغربی ادب بالخصوص انگریزی ادب کے بہت سے مستند مصنفین خصوصاً ناول نویسوں کی تصانیف کو پڑھا ہے اور ان میں سے بعض مثلاً ڈکنز اور گوئٹے کا میں بہت معترف ہوں لیکن یہ زیادہ تر ان کی ادبی عظمت کا اعتراف ہے۔ انھوں نے میرے خیالات کے بنانے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ان کا مجھ پر بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے مجھے ایک گزرے ہوئے دور کی سماجی زندگی کی جھلک دکھائی اور عالم انسانیت کے ان جذبات اور تجربات سے روشناس کرایا جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ مگر میرے خیالات کو ڈھالنے میں ان سے زیادہ بعض جدید مصنفوں کا حصہ ہے جنھوں نے گزشتہ پچاس سال میں اپنی علمی اور سیاسی تصانیف یا اپنے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کے ذریعہ اس عظیم الشان سماجی جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ جس کا مقصد انسانوں کی اجتماعی زندگی اور اُن کے باہمی تعلقات میں عدل اور انصاف کی حکمرانی قائم کرنا اور

نسل، رنگ اور دولت کے ان امتیازات کو دور کرنا ہے جنھوں نے انسانوں کی زندگی میں سے اخوت، مساوات اور شرافت کے جذبات کو خارج کر دیا ہے۔ مجھے ان تمام لوگوں کی زندگی اور کارنامے اپیل کرتے ہیں جنھوں نے اس بلند مقصد کے لئے جدوجہد کی ہے۔ مجھے وہ تمام مصنف عزیز ہیں جنھوں نے اپنے قلم کو محض جمالی تفریح کا آلہ نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعہ سے انسانوں کی سوئی ہوئی شرافت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کھلے اور چھپے مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے جو دولت مند غریبوں پر، زبردست کمزوروں پر، سرمایہ دار مزدوروں پر، سفید رنگ والے گندمی اور سیاہ رنگ والوں پر، تعصبات عقل پر، سماج افراد پر اور افراد سماج پر کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے ایک جگہ کسی یونانی مصنف کا قول نقل کیا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی حسین عورت ہے وہ میری عزیز اور رشتہ دار ہے۔ اس احساس جمال سے کہیں زیادہ میرے دل میں اس احساس انسانیت کی قدر ہے جو یہ سمجھے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی دُکھی دل ہے، یا کوئی مظلوم شخص ہے جس کی حق تلفی ہوئی ہے یا کوئی ایسی جماعت ہے جس کی خداداد آزادی سلب کرلی گئی ہے وہ میری دوست عزیز اور رشتہ دار ہے اور اس کی حمایت کرنا، اس کی خاطر جہاد کرنا میرا مقدس فرض ہے۔ یہی احساس ہے جو ان تمام مصنفوں میں کم و بیش مشترک ہے جن کے خیالات نے مجھے متاثر کیا ہے۔

اس جماعت میں بہت سے لکھنے والے شامل ہیں جو فنی اعتبار سے ایک

دوسرے سے مختلف ہیں اور ادبی لحاظ سے ہم پلہ نہیں لیکن ان میں انسانیت کا درد اور اس کو دور کرنے کی تڑپ مشترک ہے۔ میں ان میں سے انگلستان کے برٹرنڈرسل برنارڈ شا اور ایچ، جی ویلز، فرانس کے اناتول فرانس، اور روماں رولاں، امریکہ کے اپٹن سنکلیر کو بلند مرتبہ دیتا ہوں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ انھیں اپنے ملک اور اپنے زمانہ کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس ہے۔ ان کی وطن دوستی اندھی نہیں روشن ضمیر ہے۔ یہ دور حاضر کی فنی اور صنعتی ترقی اور سائنس کے کمالات سے چکا چوند ہو کر ایک سستی اور ادھی قسم کی خود پسندی اور قومی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی قوت تنقید کو بیدار رکھا ہے اور ایک سبک دست سرجن کی طرح سے ان فساد کے مرکزوں کو ٹٹول کر صاف کرنے کی کوشش کی ہے جو سماج کے جسم کو بیمار اور اُس کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔

برنارڈ شا نے انگریزی سماج، مغربی تہذیب اور اس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے ناپاک مظاہر کو تلاش کیا اور ایک ایک کو اپنی بے پناہ صاف گوئی اور ظرافت کے ساتھ بے نقاب کیا اور انگریزوں کی مخصوص خود پسندی اور جمود کو زبردست ٹھیس لگائی۔ ابتدا میں قدامت پسندوں نے اس کو ایک دلچسپ اور بے ضرر مجنون سمجھا، پھر اس کے بڑھتے ہوئے اثر سے ناراض ہو کر اس کو باغی اور مخرب اخلاق ٹھہرایا۔ اور جب اس کی بہت سی "بغاوتیں" نئی نسل کے نظام خیال کا جزو بن کر معزز بن گئیں تو انھوں نے اپنی خاص قومی ادا کے بموجب اس کو قصر ادب میں

جگہ دے دی اور اس کی تصانیف کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے درس میں شامل کر کے انھیں ایک حد تک بے ضرر بنا دیا! اس کی تصانیف نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ سماجی نظام کو بے چون وچرا تسلیم کر لینا اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا نہ صرف عقل کے ساتھ بے انصافی ہے بلکہ اخلاق کا بھی خون کرنا ہے'

برنارڈ شا کے ڈراموں میں سے چند نے خاص طور پر مجھے دعوتِ فکر دی ہے اور زندگی کے بعض تاریک لیکن اہم پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے مثلاً Parents and children (والدین اور بچے) جس میں مصنف نے تعلیم و تربیت کے مسائل اور بچوں اور ان کے والدین کی نفسیات سے اپنے خاص انداز میں بحث کی ہے "ڈوسوں کی زندگی کے لئے آزادی دہم عیسیٰ کا مرتبہ رکھتی ہے اور والدین، اساتذہ حکام سب اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح آزادی کو ملیامیٹ کر دیں تاکہ اس وقت بچوں کی زندگی خاموشی اور سکون کے ساتھ گزرے خواہ آیندہ چل کر وہ بالکل ہی تباہ ہو جائے!" یا The Adventure of The Black girl in search for god سیاہ فام لڑکی کی تلاش حق) جس میں اُس نے مذہب کے ارتقائی تصور سے بحث کی ہے۔ یا Back To mathoselah (رجوع بہ میتھوسلا) جس میں انسانی تاریخ کا ارتقا دکھایا ہے۔ اس نے سوئے ہوئے دماغوں کو جھنجھوڑنے کا کام بہت کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے'

برٹرنڈ رسل کو قدرت نے ایک غیر معمولی دماغ دیا ہے۔ کبھی وہ روشنی کا ایک

فوارہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس طرف مُڑ جاتا ہے انفرادی اور سماجی زندگی کے تاریک گوشوں کو روشن کر دیتا ہے۔ کبھی وہ ایک تیز دھار والی تلوار ہے جو اُن تنگ نظر تعصبات کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہے جن کے سایہ میں عام طور پر لوگوں کی بزدل عقلیں پناہ لیتی ہیں۔ وہ بھی برنارڈ شا کی طرح بت شکن ہے۔ نسل، قومیت، کلیسا، رنگ، وطن غرض وہ تمام مسکرات جو دولت اور قوت کے پجاریوں نے عوام کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے بنائے ہیں اس کی تنقید کی زد میں آتے ہیں۔ اس نے مختلف علوم اور مضامین پر قابل قدر کتابیں لکھی ہیں اور ہر میدان میں عقل اور آزادی کی حمایت کی ہے۔ اپنی تعلیمی تصنیف Education and The Social order (تعلیم اور نظام معاشرت) میں اُس نے اس بات کو واضح کر کے دکھایا ہے کہ تعلیم کے نظام اور نصب العین پر موجودہ سرمایہ داری، قومیت اور مذہب کی بندشوں کا کیا اثر پڑا ہے اور وہ کس طرح ان بندھنوں میں گرفتار ہو کر بجائے انسانی دماغ اور ضمیر کو آزاد کرنے کے ان کو اسیر اور محدود کرنے کا آلہ بن گئی ہے۔ اس کتاب میں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ تعلیم کو کس طرح ان زنجیروں سے آزاد کر کے ایک بہتر اور زیادہ انصاف پرور سماج کو قائم کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان ذرائع کی بحث سے زیادہ اہم اس کا یہ بنیادی اصول ہے کہ تعلیمی مسائل کو زندگی اور سماجی ماحول اور اثرات سے بے تعلق سمجھنا اور معلموں کا سیاست اور اقتصادیات کی تلخ اور ناگوار حقائق سے بے خبر یا بے پروا ہونا ایک شدید جرم ہے۔ تعلیم خلا میں نہیں دی جاتی بلکہ ان تمام طاقتوں

اور سماجی مسائل کے ماحول میں دی جاتی ہے جو سوسائٹی کے نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ہر مسئلہ کو زندگی کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہیئے۔ ورنہ مدرسہ ادب، دانش اور ذوق کی شراب سے بیگانہ ہوگا اور اس کی حقیقت "کارگہ شیشہ گراں" سے بڑھ کر نہ ہوگی۔ رسل نے اپنی ایک اور کتاب Conquest of Happiness (تسخیرِ مسرت) میں اس نکتہ کو حل کیا ہے کہ افراد کی زندگی میں سچی اور پائدار خوشی کن حالات میں راہ پا سکتی ہے۔ اس نے دو قسم کی خوشی میں امتیاز کیا ہے ایک وہ خوشی جسے وہ (Possessive Happiness) کہتا ہے۔ یہ وہ خوشی ہے جو عام طور پر گھٹیا دل و دماغ کے لوگوں کو مال و دولت، اسباب و سامان، قوت، حکومت غرض مختلف قسم کی چیزوں کو جمع کرنے اور ان پر تصرف پانے سے حاصل ہوتی ہے، زندگی کی جانب وہ اس نیت سے بڑھتے ہیں کہ اس کی فراوانیوں بالخصوص مادّی فراوانیوں میں سے وہ اپنی ذات کے لیے زیادہ سے زیادہ کس قدر بٹور سکتے ہیں، دوسری خوشی کو وہ (Creative happiness) یعنی تخلیقی مسرت کا نام دیتا ہے۔ یہ وہ خوشی ہے جو انسان کو ایسے مفید اور جدت آفریں کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے، جن میں اُسے اظہارِ خودی کا موقع ملے، جو شخص اس مسرت کی بے پایاں لذت سے بہرہ مند ہوتا ہے اسے یہ فکر نہیں ہوتی کہ وہ دنیا کی پونجی میں سے اپنی ذات کے لئے کتنا کچھ لے سکتا ہے بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ دنیا کو اپنی ذات کی انتھاہ دولت اور امکانات سے کیا کچھ دے سکتا ہے۔ یہ

وہ مسرت ہے جو مصور کو اپنی تصویر کشی میں، شاعر کو اپنی شاعری میں، ڈاکٹر کو مرض کے خلاف کامیابی کے ساتھ جنگ کرنے میں، سماج کی سیوا کرنے والے کو ایثار کی آزمائیشوں میں، سائنس داں کو نئے حقائق کا انکشاف کرنے میں، سیاح کو نئی دنیا دریافت کرنے میں حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی کی کشتی محض Pommo Happiness ke samandar mein کھیتے ہیں وہ لازمی طور پر رقابت اور خود غرضی اور بے جا تصرف کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں کیونکہ ان کی خوشی محض بیرونی اشیاء کی غلام ہوتی ہے اور جب ان چیزوں کے لئے چھین جھپٹ کی جاتی ہے (جو موجودہ اقتصادی نظام کی نامبارک بنیاد ہے) تو اس کا نتیجہ ہر لحاظ سے خراب ہوتا ہے جیتنے والوں کے ضمیر پر چوروں کی طرح خوف کا تسلّط رہتا ہے' اور ہارنے والے اپنے نزدیک زندگی کا بہترین انعام کھو بیٹھتے ہیں اس لیے اُن کے واسطے زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے تخلیقی مسرت خودی کی لہر کو سمندر کی وسعت سے ہمکنار کر دیتی ہے' وہ انسان کو اُس کی ذات کے تنگ اور محدود بندھنوں سے آزاد کر کے یہ احساس دلاتی ہے کہ دنیا میں بہت سے بڑے بڑے مقاصد ایسے ہیں جن کے لئے جد و جہد کرنا شخصی دکھ سکھ اور خوف و رجا سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مثلاً ادب، آرٹ، مذہب، سائنس، سماجی خدمت ان میں اپنی خودی کو گم کرنا، در اصل خودی کو پالینا ہے۔ کیونکہ ان اہم قدروں میں جذب ہو کر خودی شکست و ریخت اور زوال اور موت کی دسترس سے بھی آزاد ہو جاتی

ہے۔ یا سادہ الفاظ میں یہ سمجھ لیجیے کہ آدمی مرجاتا ہے لیکن اس کا کام زندہ رہتا ہے۔ اس نے جو شمع روشن کی ہے، خواہ وہ خدمت خلق کی ہو یا ادب کی، یا آرٹ کی، یا سائنس کی، وہ جلتی رہتی ہے اور روشنی پہونچاتی رہتی ہے، اسے اجل کی پھونک بھی نہیں بجھا سکتی۔ اس طرح اس کی خودی بھی ہمیشہ زندہ اور پائندہ رہتی ہے، خیال بہت پرانا ہے لیکن رسل نے اس کو بڑی وضاحت اور قوت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ نقطۂ نظر زندگی کے سفر کے لیے یقیناً ایک سب سے بہتا شمع ہدایت ہے۔

ایچ۔ جی۔ ویلز کا علمی مرتبہ ان دونوں کے برابر نہیں۔ اس میں نہ اتنی قوت فکر ہے نہ اجتہاد، وہ پروپیگنڈا زیادہ کرتا ہے۔ اس کی رائے اکثر بے جا حد تک اس کے خاص مرکزی خیال کی تابع ہوتی ہے۔ مگر باوجود اس کے اس نے علمی مفکرین اور تعلیم یافتہ عوام کے درمیان ایک نہایت ضروری اور قابل قدر واسطے کا کام دیا اور اپنے ناولوں اور دیگر علمی تصانیف کے ذریعہ جدید معاشرتی علوم اور سائنس کے نظریوں کو مقبول کرایا ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہر ہر طریقہ پر قومیت کے تنگ تصور کے خلاف جہاد کیا ہے اور انسانیت کے وسیع اور مقدس رشتہ کی وکالت کی ہے۔ وہ اس اصول کا پرچار کرتا ہے کہ عقل اور سائنس کو سماجی اور سیاسی مسائل میں بھی اسی طرح راہبر بنانا چاہیئے جس طرح اُن سے نظری علوم میں کام لیا جاتا ہے۔ اس وقت سیاسی اور اقتصادی تعلقات اور مسائل کم

جذبات کا غلبہ ہے۔ ان کے حل کرنے میں عقل کی کارفرمائی کو بہت کم دخل ہے۔
ویلز کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر سائنس کو محض چند اصولوں، نظریوں اور علمی ایجادوں کا مجموعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ایک طریقۂ فکر، ایک تفتیش و اجتہاد کا ذریعہ قرار دیا جائے تو ہمارے بہت سے سماجی اور سیاسی جھمیلے جو اس وقت انسانیت کے لئے سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں معقولیت کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں۔ ویلز نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں سائنس کے کمالات اور آئندہ امکانات کو دکھایا ہے، انسانی سیرت اور انسانی سماج کی ارتقا سے بحث کی ہے، ان خارجی نفسیاتی گتھیوں کو پیش کیا ہے جو اس کی آزادانہ نشو و نما میں حارج ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا مرکزی موضوع یہی رہا ہے کہ ایک بہتر معاشرے اور اس کے لئے شایانِ شان افراد کی تربیت کیسے کی جا سکتی ہے۔ وہ دل اور دماغ کو وہ گرمی اور روشنی تو نہیں بخشتا جو بصیرت اور گداز پیدا کرتی ہیں لیکن نظر کے سامنے نئی اور لامحدود فضائیں اور امکانات ضرور پیش کر دیتا ہے۔

اناطول فرانس جو بعض اعتبار سے گذشتہ صدی کا سب سے بلند پایہ فرانسیسی مصنف ہے ان مصنفوں سے مختلف ہے۔ اس میں آرٹ زیادہ اور پروپیگنڈا کم ہے، اس کے مطالعہ اور تفسیر کا خاص موضوع سوسائٹی اور اس کی تشکیل نہیں بلکہ نفسِ انسانی کی گہرائیاں اور پیچ ہیں جن کو وہ اپنے مخصوص طنز اور ظرافت کے ساتھ کھول کر رکھ دیتا ہے لیکن اس کا یہ طنز احساس اور ہمدردی سے خالی نہیں بلکہ ایک نقاب ہے جس میں وہ اپنی ہمدردی اور رحم کے جذبہ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس کا موضوع

تاریخی کردار اور تاریخی واقعات ہوتے ہیں، جیسے God are Thirsty
(دیوتا پیاسے ہیں)، میں جہاں وہ انقلاب فرانس کی تصویر کھینچتا ہے، کبھی وہ
انسانی جذبات اور آئیڈیل کی کشمکش دکھاتا ہے جیسے The Red Lily یا
Thais (تائیس) میں۔ جہاں اس کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ

زاہد غرور کرد و سلامت بدر براہ   رندا ز رہِ نیاز بہ دار السلام رفت

کبھی وہ ایک ایسی سیدھی سادھی شریف انسانی سیرت کے خد و خال نمایاں
کرکے دکھاتا ہے جس کی طرف خود بخود دل کھنچتا ہے جیسے (Crainquebille
میں۔ لیکن اس کا کام وکیل عدالت کی طرح انسانی
کمزوریوں کی نمائش سے لطف اُٹھانا نہیں ہے۔ وہ ایک جج کی طرح ان کے
خلاف سزا کا حکم بھی نہیں سناتا۔ وہ تو محض گہری ہمدردی، بڑی گہری سمجھ داری
کے ساتھ یہ دیکھتا اور سمجھاتا ہے کہ اکثر اوقات انسان مختلف داخلی اور خارجی
قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہے اور درحقیقت اپنے اعمال کے لئے جواب دہ
نہیں ہوتا۔ اس لئے جرم اور مجرم میں تمیز کرنا انسان کا نہایت ضروری فرض ہے،
ایک نیک اور با اخلاق اور با اصول آدمی جرم سے نفرت کرسکتا ہے، لیکن اس کو
مجرم سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اگر حالات
ذرا سے مختلف ہوتے تو وہ خود اسی طرح ارتکاب جرم کرتا۔ لہذا شیشے کے
گھروں میں رہنے والوں کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ دوسروں پر پتھر پھینکیں،

اناطول فرانس کے فلسفۂ زندگی نے مجھے یہ انمول سبق سکھا یا کہ بقول فرانسیسیوں کے (Yad com preren dre est loat Pardoner) (جو آدمی سب کچھ سمجھ سکتا ہے وہ سب کچھ معاف بھی کر سکتا ہے) شاید اسی وجہ سے میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کسی شخص سے جو کسی گناہ یا جرم کا مرتکب ہوا ہو اس قدر شدت اور ذاتی کد کے ساتھ اظہار نفرت یا مخالفت کر سکوں جیسے بعض مدعیان مذہب و عصمت کیا کرتے ہیں۔ جن کی رائے شاید سطح سے نیچے اتر کر نفس کی گہرائیوں تک نہیں پہونچتی۔

فرانس کا ایک اور مایۂ ناز مصنف جو آزادی اور انسانیت کی جنگ میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور جس کی تصانیف نے مجھے بہت متأثر کیا ہے روماں رولاں ہے۔ اس کا قلم ایک تلوار ہے جس نے ہمیشہ ان حقوق کی خاطر جنگ کی ہے جو ہر انسان کو بہ حیثیت انسان کے، ہر قوم کو بہ حیثیت ایک قوم کے حاصل ہونے چاہئیں، لیکن دوسروں کے ظلم اور تصرف نے انھیں اپنے ان پیدائشی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ روماں رولاں ایک بلند پایہ آرٹسٹ بھی ہے جس کی تحریر میں موسیقی کا رقص اور توازن ہے اور ایک پُرجوش مبلغ بھی، جس کے الفاظ میں طوفان کی شوکت اور انسانیت کے دھڑکتے ہوئے دل کا ولولہ ہے۔ اپنے معرکۃ الآرا ناول (Jean chris-tophe جین کرسٹوف) میں وہ ایک نوجوان کی سیرت کا ارتقا دکھاتا ہے

جو قدرت کی طرف سے موسیقی کی غیر معمولی صلاحیت لے کر آیا ہے، لیکن باوجود آرٹ کا پجاری ہونے کے اپنے ماحول کے مقناطیسی اثرات سے متأثر ہو کر وہ خود کو اس سیاسی کشمکش میں جھونک دیتا ہے جو اس کے گرد و پیش جاری ہے۔ اس ناول میں رولاں نے یورپ کی اُس تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے جو گزشتہ جنگ عظیم سے پیشتر اہل یورپ بلکہ تمام دنیا کو مسحور کیے ہوئے تھی، لیکن بعض صاحبان بصیرت کو اس ظاہری شان و شوکت کے اندر تباہی اور فساد کے جراثیم بھی کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ انھیں میں رولاں کا شمار ہے۔ اُسے یقین تھا کہ مغرب کی اندھی مادیت، سرمایہ داری، قوت کا نشہ، قومیت کا غرور، سامان جنگ کے بارے میں قوموں کی رقابت اور رنگ و نسل کا تعصب اُسے تباہ کر کے رہے گا۔ اور ایسا ہی ہوتا نظر آرہا ہے۔ اپنے ایک اور ناول (Soul enchanted) (روح مسحور) میں اس نے جنگ کے بعد کے یورپ کا نقشہ کھینچا ہے اور ان قوتوں کا ابھار دکھایا ہے جن کا مقصد سماجی انصاف کا قیام ہے۔ لیکن قوت اور سرمایہ کے ٹھیکہ داروں نے اپنے اغراض اور مفاد کی حفاظت کے لیے ہر ذلیل اور ظالمانہ طریقہ سے ان شریفانہ جذبات کو اور آزادی کی تمام تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی۔ رولاں کے قلم سے اس کشمکش کا بیان پڑھ کر خون کھولنے لگتا ہے۔ اگر ایک "ترقی پسند" ادیب کا کام یہی ہے کہ وہ لوگوں میں صحیح جذبات کو بیدار کرے اور انھیں حق کی حمایت اور ظلم کی مخالفت پر

آمادہ کرے تو رولاں بدرجۂ اتم ایک ترقی پسند ادیب ہے۔ اس نے اپنی سیاسی تحریروں اور تقریروں اور ہر قسم کی تصانیف میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھا ہے کیونکہ وہ "ادب برائے ادب" کا قائل نہیں ہے۔ وہ تو ادب کو زندگی کی بھٹی میں جھونک کر اُسے کندن بنانا چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے مضامین کا ایک مجموعہ جو چند سال ہوئے شائع ہوا تھا (I will not rest) (میں آرام نہ لوں گا) کے نام سے موسوم ہے۔ کوئی حسّاس اور انسان دوست ادیب بھی اس جد و جہد کے زمانہ میں آرام نہیں لے سکتا، ادب کی پرسکون سرزمین میں بھی آرام نہیں لے سکتا!

امریکہ کے مصنفوں میں سے میری نظر میں اپٹن سنکلر (Upton Sinclair) کی خاص قدر ہے۔ اس نے گزشتہ چالیس پچاس سال میں بہت سے ناول، کہانیاں اور سیاسی اور سماجی مضامین لکھے ہیں جن میں سے ہر ایک میں اس نے امریکہ کی تہذیب اور معاشرت کے تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور غیر معمولی جرأت سے کام لے کر سرمایہ داری اور ظلم کے ان زبردست قلعوں پر ضرب لگائی ہے جو مہذب اور متمدن امریکہ کی زندگی پر ایک خون آشام دیو کی طرح مسلط ہیں۔ اس کی کتابوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں اس کے خلاف بیسیوں مقدمہ چلانے کے لئے مواد موجود ہے، لیکن چونکہ ان کی بنیاد صداقت پر رکھی گئی ہے اس لئے کبھی کسی کو عدالت میں چارہ جوئی کرنے کی ہمت

نہیں ہوئی! البتہ اس کی مخالفت میں اور اس کو مالی اعتبار سے تباہ کرنے کے لئے وہ تمام حربے ضرور استعمال کیے گئے جو آزاد امریکہ کی سیاسی زندگی کا مخصوص امتیاز ہیں! لیکن اس نے بدنامی، افلاس، حق تلفی، غرض ہر قسم کی مصیبتوں کو برداشت کیا، لیکن حق گوئی اور حق دوستی کے کٹھن راستہ کو نہیں چھوڑا۔ اس نے امریکہ کی تہذیب کی تنقید اُس وقت شروع کی تھی جب وہاں کے تقریباً تمام ممتاز ادیب اور مفکر جدید مادّی اور صنعتی ترقی کے نشہ میں سرشار تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ علوم و فنون کی ترقی اور سرمایہ داری نظام کی دولت آفرینی نے انسانی زندگی کے تمام اخلاقی اور سماجی مسائل بھی حل کر دیے ہیں اور انھیں اس بات کا احساس ہی نہ تھا کہ غازۂ تہذیب کے پیچھے انسان کی فطرت کی سیاہی اور حرص اور تصرف کی قوتیں بدستور موجود ہیں۔ اس عالمگیر خوش فہمی کو چیلنج کرنا اور خود فریبی کے اس طلسم کو حقیقت نگاری کی ضرب سے توڑنا بڑے دل گردہ کا کام تھا، لیکن سنکلیر نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا اور اس شان کے ساتھ انجام دیا کہ اس کا نام ادب کی تاریخ میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ اس نے اپنی مختلف کتابوں میں امریکن زندگی کے مختلف بدنما پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے مثلاً "جنگل" میں امریکہ کے صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی اس رقابت اور کشمکش کو دکھایا ہے جس کی بے رحمی اور بے اصولی کے سامنے جنگلوں میں حیوانوں کی زندگی غنیمت معلوم ہوتی ہے (Oil) (تیل) میں ان زیادتیوں اور مردم آزاریوں کو

طشت از بام کیا گیا ہے جو تہذیب حاضرہ کے محرک اعظم یعنی پٹرول کے بڑے بڑے کارخانہ داروں نے مزدوروں کے ساتھ روا رکھی ہیں، "فلورکنگ" میں اس نے موٹر کاروں کی صنعت کے تاجدار ہنری فورڈ کی سیرت کے ارتقا کا عبرت خیز نقشہ کھینچا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شریف اور نیک نیت آدمی دولت اور سرمایہ داری کی دلدل میں پھنس کر اپنی فطری انسانیت کھو بیٹھتا ہے اور بجائے دولت کے ذریعۂ آزادی حاصل کرنے کے اس کی بے شمار ظاہر اور پنہاں زنجیروں میں اسیر ہو جاتا ہے، ایک اور کتاب میں جس کا نام ہے، (money writes) (روپیہ لکھتا ہے) اس نے یہ راز فاش کیا ہے کہ اخباروں کی رائے اور بیشتر کتابوں کی اشاعت بھی دولت کی غلام ہے اور اس جمہوری حکومت میں آزادی رائے کا دعوے محض دھوکہ یا خام خیالی ہے۔ چند بڑے سرمایہ داروں نے بیشتر اخباروں اور اشاعت خانوں پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے ذریعہ سے یہ رائے عامہ کو جس سانچے میں چاہتے ہیں ڈھال لیتے ہیں اور پروپیگنڈا کے ذریعہ ہر قسم کے پبلک اداروں کو اپنے قبضہ کے اندر رکھتے ہیں۔ اس خوفناک حربہ کی مدد سے وہ نہایت آسانی اور کامیابی کے ساتھ ہر ایسے جدید اور انقلاب آفریں خیال کا سر کچل دیتے ہیں جن سے ان کے مفاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ خود سنکلیر کے خلاف یہ زبردست قوت نہایت بے باکی اور بدباطنی کے ساتھ برابر استعمال کی گئی۔ خیالات کو اپنے مجوزہ

سانچوں کے اندر رکھنے کے لئے یہ لوگ محض پریس کی قوت ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب، طریقۂ تعلیم، نظم ونسق اور استادوں کے تقرر پر بھی اپنا قابو رکھتے ہیں۔ تعلیم کے اس پہلو کی تفسیر اس نے (she goes step) میں کی۔ ہے جس کا ترجمہ "قدم ملا کر چلنا" کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہی "ہم قدمی" ہے جس کا انتہائی مظاہرہ موجودہ جرمن قوم کی ذہنیت میں نظر آتا ہے، جہاں قوت فکر وتنقید پر "اندھیریاں" لگا دی گئی ہیں، یعنی ایک فرض شناس شہری کا یہ کام نہیں کہ وہ دائیں بائیں دیکھے یا حکومت کی پالیسی پر تنقید واحتساب کرے، اس کا کام محض یہ ہے کہ جس طرف اس کی نکیل موڑ دی جائے اُسی طرف قدم بڑھائے جائے۔ لیکن یہ "ہم قدمی" صرف نازی جرمنی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ اس کا مظاہرہ کم وبیش ان تمام ملکوں میں بھی موجود ہے جہاں بظاہر جمہوریت کا نظام قائم ہے۔ سنکلیر نے یہ راز فاش کیا ہے کہ جمہوری امریکہ میں بھی فکر کی اسیری کے لئے ایک پیچیدہ اور گراں نظام تعلیم قائم کیا گیا ہے۔ ایک تازہ تصنیف (The worlds end) (دنیا کا انجام) میں اُس نے گزشتہ جنگ عظیم کے پوست کندہ حالات بیان کئے ہیں اور دکھایا ہے کہ کس طرح درپردہ بین الاقوامی سیاست کی مہاران چند بڑے کارخانہ والوں کے ہاتھ میں تھی جو سامان جنگ بناتے تھے اور منافع کمانے کی ناپاک کوشش میں دیانت اور حب وطن کا خون کرنے میں مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ علاوہ اس قسم کے بامقصد ناولوں کے اس نے

اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے ہر ایک میں اس کی شریف آزاد انصاف پسند اور قابل محبت شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہر ایک میں اس کے ذہنی آئیڈیل اور ماحول کی تلخ حقیقتوں کا تقابل نظر آتا ہے۔ اس نے ایک کہانی کی شکل میں حضرت عیسیٰؑ کی ایک سوانح عمری لکھی ہے، جس کا نام (They call me Carpenter) (انھوں نے میرا نام بڑھئی رکھا ہے) اس میں اس عبرت انگیز حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ اگر کہیں (خدانخواستہ) حضرت عیسیٰؑ کا ظہور اس زمانہ میں ہوجائے اور وہ امریکہ کی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیں جس کی بنیاد بظاہر مسیحیت پر رکھی گئی ہے تو امرا اور ارباب سیاست اور کلیساؤں کے پیشواؤں میں ہلچل بپا ہوجائے اور حکومت مذہبی لیڈروں کی رضامندی سے اُن کی انقلابی تعلیم کو خطرناک اور مفادِ عامہ کے مخالف قرار دے کر یا تو انھیں قید خانہ میں بند کردے یا مجنون قرار دے کر ان کی آزادی سلب کرے یا ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھے جو دو ہزار سال قبل رومیوں نے کیا تھا!

دنیا میں ہر قسم کی ترقی انھیں لوگوں کے طفیل ہوئی ہے جنہوں نے اپنے زمانہ کے ناقص نظام کو بے چون و چرا تسلیم نہیں کیا اور اس کے رنگ میں رنگ کر اس کی کمزوریوں اور خرابیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے آرام اور عیش و عشرت کی زندگی اختیار نہیں کی۔ بلکہ اپنی روشن ضمیری کی بدولت ایک بہتر دنیا کا تصور قائم کیا، یا اپنے وجدانی تخیل کی روشنی میں ایک بہتر دنیا کی تصویر دیکھی اور

پھر جرأت کے ساتھ مخالفت کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلتے ہوئے بے حس اور تنگ نظر لوگوں کے سامنے اپنے تصور کی دنیا کی تصویر کھینچی۔ اور ان کو موجودہ حالات سے بیزار کر کے ایک بہتر مستقبل کی طرف مائل کیا۔ یہی کام ہے جسے غیر معمولی قابلیت اور جرأت کے ساتھ سنکلیر نے تمام عمر انجام دیا ہے۔ شاید اس کا اپنا فلسفۂ زندگی ان الفاظ سے واضح ہو جائے جو اس نے اپنی ایک غیر معروف کتاب (Jimmie Higgins) (جمی ہگنز) میں لکھے ہیں، اس کا ہیرو ایک غریب اور کم رو اور معمولی درجہ کا سوشلسٹ تھا، لیکن اس کے دل میں دیانت اور وفاشعاری اور دوست داری کا ایک ایسا شعلہ روشن تھا کہ باوجود ہر قسم کی ایذارسانی اور ناقابل برداشت جسمانی کرب جھیلنے کے اس نے اپنی جان دینا گوارا کیا، لیکن اپنے ساتھیوں اور سیاسی رفیقوں کا بھید نہیں دیا! جس وقت اس کی بہادر روح اس کے دکھی اور کمزور جسم سے رخصت ہو رہی تھی اس کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے:-

"میں انسان ہوں اور آخری فتح میری ہو گی۔ میں جسم کی کمزوری کو کچل ڈالتا ہوں اور اس پر قابو پالیتا ہوں۔ اگر میرے جسم کو قید کر لیا جائے تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر اس پر خوف طاری ہو گا یا مصلحت اندیشی زنجیر پا ہو گی تو اس کو ٹھکرا دوں گا۔ میں صداقت ہوں اور دنیا کو میری آواز سننی ہو گی۔ میں انصاف ہوں اور دنیا پر میری حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ میں آزاد ہوں اور تمام قوانین کو

توڑتا آتا ہوں، میں ظلم کو خاطر میں نہیں لاتا، میری ہمت بلند ہے، میں رہائی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

اور چونکہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں انسان کی روح میں اس مبارک قوت کا جلوہ رہا ہے اور یہ غیبی آواز اپنا پیغام سناتی رہی ہے اس لئے انسانیت تاریکی اور درندگی سے نکل کر کم ازکم اس مقام تک پہونچ گئی ہے جہاں اس کو ایک زیادہ بہتر اور شادکام مستقبل کا خواب نظر آتا ہے اور اگر دنیا اس خوف اور بربریت کے تسلّط سے نکل سکتی ہے جس میں آج کل ظالموں کے لالچ اور ظلم نے اُسے پھنسا دیا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جن خیالات کا پرچار انھوں نے اور اُن جیسے دوسرے بلند خیال اور انسان دوست مصنفوں نے کیا ہے وہ دنیا میں عام ہو جائیں اور لوگ اپنی بنائی ہوئی قید خانہ کی کوٹھریوں سے نکل کر خدا کی کھلی ہوا اور روشنی میں سانس لینا سیکھیں۔ ادب کا کام اور کتابوں کا احسان یہی ہے کہ وہ لوگوں کی انسانیت اور ہمدردی اور محبت کو وسیع کریں اور ان کے دل و دماغ کو تنگ نظری تعصّب اور بے انصافی کی یورش سے بچائیں۔ اگر کتابیں ایسا کریں تو وہ "محسن" ہیں ورنہ محض وقت گزارنے اور تفریح کا ذریعہ یا چارپائے پر معلومات کا بوجھ ہیں، یا عالم کی بے فیض دولت ہیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی بہت قدر کے قابل نہیں!۔

از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی مدیر ترجمان القرآن

جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اُتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں، بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں اُلجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، پھر بھی حل نہ کر سکے، ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے۔ میری اصلی محسن بس یہی ایک کتاب ہے اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔ حیوان سے انسان بنا دیا، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے انگریزی میں اس کنجی کو "شاہ کلید" (Master Key) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے سو میرے لیے یہ قرآن "شاہ کلید" ہے، مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اُس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

ازمولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء

(مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی کی فرمائش سے لکھا گیا اور ۲۹ ر ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس علمی میں پڑھا گیا۔)

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ ہے جس کے بزرگوں نے کبھی فصل خزاں میں بھی دنیا کو پیام بہار سنایا تھا۔ ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا۔ ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین داری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۴۱ھ کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت ۱۰ سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مدظلہ لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا، اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی منظوم فتوح الشام پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمشیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحبؒ کے پوتے اور اُن کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحب کے نواسے تھے، واقدیؒ کی عربی فتوح الشام کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچپن ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے' چونکہ اُن کو اس کا طبعی ذوق تھا اور جہاد و حرارت ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا۔ اس نظم میں جوش واثر اور کلام میں آمد ہے، حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شاعر کو عشق تھا اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظہ تھیں، یہ منظوم فتوح الشام بڑے پُر اثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے کتاب اُن کو بہت رواں ہو گئی تھی۔ عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آجاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بالارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں' پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف لیکن پُر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں

توجہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل اُمنڈ آتے۔ حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہ بنتؓ لازور اور دوسرے صحابہ کرام و مجاہدین شام کی جاں بازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اُٹھتے اور برستے تو اُن کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا۔ اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا۔

فتوح الشام کی ان زندہ مجلسوں نے دل پہ یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت وعظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی، خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے، جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے بیداری بخشی ہو۔

اتانی ھواھا حین لم اعرف الھویٰ　　فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب کے خلاف (جس کے مقدر میں قیامت تک کے لئے اسلام کا عالمگیر حریف و مدمقابل بننا لکھ دیا گیا ہے اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے) ایک حریفانہ

جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا، جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آسکے۔

اس وقت شرفا کے خاندانوں میں مسدس حالی کا عام رواج تھا، اس کے اشعار لوگوں کے نوکِ زبان تھے۔ تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کیے جاتے میں نے بھی مسدس کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا، اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں اور ان انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لئے لکھے جاتے، بار بار نقل کئے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر مسدس کا اچھا خاصہ اثر رہ چکا ہے۔ عام استعداد کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مورخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اس کو چنگاری دکھا دی گئی، اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی ہیبت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے اُن پُر اثر اور سادے چند بند پر غالب نہ آسکی جن میں اُنھوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اُس کی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے،

نہ بعض قوم پرست عربوں کے مضامین اور تالیفات متاثر کرسکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ قاضی سلیمان صاحب منصورپوری مرحوم کی سیرت رحمۃ للعالمین کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی۔پی رابطہ آیا ہے اور اس کے چھڑانے کے لئے اس وقت روپیہ نہ تھا تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی، کسی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا، بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعب بن عمیر کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری اور حضرات انصار کی مسرت، استقبال اور جان نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات و حالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا، ٹہل ٹہل کر ان کو پڑھتا تھا، لوگوں کو سناتا تھا اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں، قاضی سلیمان صاحب کے

درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ اس نے سب سے پہلے سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور عالم خس و خاشاک ہے ؎

درخرمن کائنات کردیم نگاہ ؎ یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انھیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آگئی۔ مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر! پڑھی اور کئی بار پڑھی، عراق کی جنگوں بویب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے شاید اس سے زیادہ اثر فردوسی شاہنامہ میں مسلسل اشعار اور پُرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کرسکا، الفاروق کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر وسناں کا کام کرتے ہیں، مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے، اُس کے سمجھنے کی اُس وقت صلاحیت نہ تھی اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے۔ لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اُس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب کی صحبت اور مجلسوں میں "آب حیات" سے تعارف ہوا، سُنی اور بار بار پڑھی یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے، اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سُنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں اور ان کا دماغ پر

کوئی بار نہیں ہوتا۔

گلِ رعنا گھر کی کتاب تھی اس کو اتنے بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعرا کے متعلق اتنے معلومات ہوگئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہوگئی۔

میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا، اُن کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مومن، غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعرا میں سے آتش کے کلام سے اُن کو خاص ذوق تھا؛ چنانچہ ان کے اشعار سننے اور اُن کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔

اس زمانہ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا، جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی نیرنگِ خیال بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے

اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصع نمونہ ہے بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک "نیرنگ خیال" اور "آب حیات" کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کیئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے۔ یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم، مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے بیکار و بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لیئے اس کا دعوے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یاد ایام" کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے۔ اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے۔ جو میرے علم میں مصنف گل رعنا اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے، "اندلس" پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لئے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لئے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق و شوق سے پڑھائی، عربی ادب اور بالخصوص عربی

شعر کا عرب صاحب کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد ہیں جس کے متعلق زبانِ نبوت نے شہادت دی ہے۔ کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے (الایمان یمانٍ) عجم کا "حسنِ طبیعت" ننہیال سے اور عرب کا "سوز دروں" انھوں نے دادیہال سے پایا ہے۔ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں۔ قصائد پڑھتے ہیں تو سوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ توحید ان کا ذوقی مضمون ہے، دل کھول کر پڑھایا اور دل کو توحید کے لئے کھول دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ کہ الا للہ الدین الخالص (سورۂ زمر) کا نقش قائم ہے۔ اور اس کے سامنے، ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی (زمر)، (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعوے جو ہمیشہ سے نظامِ شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے تارِ عنکبوت معلوم ہوتا ہے۔ ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا۔ جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا۔ ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال ہے۔ انھوں نے مبادیٔ صرف اور تحریر و انشا کی مشق کے ساتھ مصر و بیروت کے سلسلۂ قراءت (ریڈرس) مطالعۃ العربیۃ، الطریقۃ المبتکرہ ۵-اجزا، مدارج القراءۃ ۱-جزر کے بعد ابن المقفع کی کلیلہ و دمنہ، مجموعۃ من النظم والنثر، حصۂ نثر کا ایک حصہ

حفظًا اور حصۂ نظم، نہج البلاغۃ حصۂ کتب اور نظم میں حماسہ اور معری کی سقط الزند
اور دلائل الاعجاز للجرجانی بڑے ذوق و جوش سے نیز مختصر تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ
پڑھائی۔ عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے
ہمنام ابوالحسن علی الضریر کے رسالۂ الضریریہ کا ہے جو چند اوراق کی کتاب
ہے، عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی اور یہی مشق اس وقت تک کام
آرہی ہے، اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک وقت میں مختلف
علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم تھی اور
وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصد حیات اور وہی ذوق طبع۔ عرب صاحب کی ایک
خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین اور ان کے محبوب و
منتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے گویا وہی زبان و
ادب اور طرز ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہا ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ
مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے اور طالب علم ان کا رنگ
اتارنے لگتے تھے، ابن المقفع اور جاحظ نثر میں، عبدالقاہر جرجانی ذوق، نقد
ادب اور سخن فہمی میں، متنبی و بحتری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لئے
ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور
انداز پیدا ہو جائے، راقم الحروف نے ابن المقفع اور صاحب نہج البلاغۃ
نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی اور اس کا بڑا فائدہ ہوا۔

عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے کہ ادب و نثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انھیں باک نہیں ہونی چاہیے چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشا پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا۔

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی کتاب النظرات عرب صاحب نے دیکھنے کو دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا متبحر استاد نصیب ہوا جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مجاز تھے، یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی ماخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد و توفیق) علمی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا۔ ایک یہ کہ تعلیم بالکل آزادانہ و ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا، اور وہ اس کے زبردست وکیل و ترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث، اصول حدیث و رجال کی بحثوں پر مبنی تھا اور اس میں ہندوستانی طرز تدریس حدیث سے زیادہ یمنی طرز تحدیث اور شوکانی کے طرز تالیف کا اثر تھا۔ شوکانی کی تالیف نیل الاوطار اس کا ایک نمونہ ہے، محدثین میں خصوصاً ابراہیم الوزیر محمد بن اسمٰعیل الامیر اور علامہ مقبلی کی تالیف اور اصول حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص ماخذ تھے، جن میں تنقیح الانظار اور توضیح الافکار کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانی کی الجوہر النقی، امام زیلعی کی نصب الرایۃ سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلمہ اصول و مجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، دوسری چیز یہ کہ ان کا درس علمی تھا جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے، مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے اور کبھی کبھی مرتب کراتے تھے، بعض مرتبہ بعض کتابوں کی شرح کا کام شروع کراتے تھے۔ اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ

سکھاتے تھے۔ درس حدیث میں علمی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی شرح مسلم سے ہوا جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے، شروح حدیث سے فائدہ اُٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا۔ سب سے زیادہ اثر ابوداؤدؒ کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق نے کیا۔

اسی زمانہ میں احیاء العلوم دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس ادب کے لئے ایک فاضل و محقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے اور عجمیت و ہندیت کے طلسم ذوق و فکر پر چھائے رہتے، ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو قرن اول اور قرن ثانی و ثالث کی زبان کو مُردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع، (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لاادری کہہ دینا) مغرب اقصیٰ خصوصاً اہل شنقیط کا حفظ و استحضار، اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ

ادب کی جان ہوتا تھا جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے اغانی اور جاحظ کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سُنا، جو لکھتے تھے وہی بولتے تھے اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت در مجالس و سفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان اور زبان کے ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ و ایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں، ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے، زبان کی تعلیم تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے، اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جارہی ہے جو بے بنیاد اور بے نتیجہ ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ حریری اور متنبی و حماسہ ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلا ان کو پڑھتے

ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور مرجع خرچ ہیں، ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے، ان کا یہی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہیئے، اس پر شیخ نے دارالعلوم میں مسلسل تقریریں کیں اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا، دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف و نحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں جن کا درجہ زبان کے بعد ہے، زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف و نحو کے قواعد بیکار ہیں، مفردات، الفاظ و جمل مکان کی اینٹیں ہیں اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینیری کا فن، اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینیرنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادبا کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لئے انھوں نے ابن قتیبہ کی الامامۃ والسیاسۃ، ابن المقفع کی کلیلہ و دمنہ، ابوالفرج الاصبہانی کی کتاب الاغانی اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا، ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ "الضیاء" نکال رہے تھے، عربی زبان و تحریر، نقد و تبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا، مصری، شامی، عراقی اور مغربی (الجزائری و مراکشی) رسائل و جرائد

تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے اوران پرگفتگو رہتی تھی، یہ میرے عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا، عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا، اس لئے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے، بلکہ طرز ادا، اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے، بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا، اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب وزبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

مصری وشامی ادباء وفضلاء کے مضامین پڑھ کر اُن کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانۂ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے وہ اپنے اخبارات ورسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں اور امیر شکیب کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا وہ اس عصر کا عرب ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، لیکن معنوی وذہنی حیثیت سے ذوق ودماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشوونما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار مغرب سے ذہنی مرعوبیت

اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی، ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا، اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلاں کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی، لیکن امت اسلامیہ کے حقیقی امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں جس شخص کے خیالات و افکار میں سب سے زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی اور جس کی فراست نے متاثر کیا وہ سید عبدالرحمٰن الکواکبی کی تخیلی کتاب ام القریٰ ہے جو اب پرانی ہو چکی ہے اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔

اسی زمانہ میں ۲۷ء یا ۲۸ء میں رسالہ توحید امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا، "تیرھویں صدی کا مجدد اعظم" کے عنوان سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق مولوی محی الدین قصوری کا ایک سلسلۂ مضمون شائع ہوا۔ بھائی صاحب کے حکم سے میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار میں بھی شائع کیا اور ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کیا۔ اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیمؒ کی زاد المعاد، میر الکتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی، دنیا کے

کتب خانہ کی اتنی بہتر نمایندگی ایک کتاب میں ملنی مشکل ہے اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کردیا جائے اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روز مرّہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سب سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل ہے؛ اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رُخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے مؤثر واقعات لکھے ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پُر اثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پُر آشوب زمانہ میں دستگیری کی، یہ اور حافظ ابن قیم کی الجواب الکافی نوجوانی میں بہترین نگراں اور اتالیق اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں، زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اُٹھانے اور ان کے احترام طالب علمی کے آداب کا

لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب تعلیم المتعلم ہے۔

والد مرحوم کی تصنیفات کو اُلٹتے پلٹتے ان کا ایک مسودہ ارمغان احباب کے نام سے ہاتھ آگیا جو انھوں نے اپنی ۲۲ سال کی عمر میں لکھا ہے اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردان خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہید سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا۔ جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں وہاں دل جھوم جاتا تھا، اور دل ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت و عقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا، جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ارشاد رحمانی ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے کچھ حالات، حکایات و ملفوظات اور سلوک و طریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ میرے والد مرحوم کے شیخ تھے، اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا، اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق و شوق سے پڑھی، محبت کے اشعار اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے اور

تیر ونشتر کی طرح دل میں اُتر گئے ۔

مشائخ و بزرگانِ دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے ۔ ان مجموعوں میں حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ حضرت نظام الدین رح کے ملفوظات "فوائد الفواد" اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات "درالمعارف" کا قلب پر اثر پڑا ۔ اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی ۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں کبھی متاثر نہیں کیا ۔ البتہ درد و محبت اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے ۔ درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے ۔

ہم نے اپنے آشیانہ کے لئے　　　جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

طالب علمی کے بے قاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا، اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ و متکلم ایک جامد و خاموش، زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ، شاہ صاحب کے واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور ابن عبدالہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں،

پھر وطن واپس جاکر احیاء العلوم مع تخریج عراقی فضل علم السلف علی الخلف، ذخائر الکنوز، تلبیس ابلیس مختصر منہاج القاصدین وغیرہ منگوائیں، تلبیس ابلیس کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔ اور تصوف و تلبیس کے مطالعہ سے ایک اعتدال پیدا ہوا۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و مؤثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ سے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں جنھوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابل ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا۔ دار العلوم ندوۃ العلما کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو و نما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی ہم آمیزی اور علماء اور اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۲ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اس کو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا۔ پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا

جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب بی۔ایس۔سی، ایم۔بی۔بی۔ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی۔ جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے، یوں بھی ان کی زندگی اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتحمندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے سچ کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" (مترجمہ مولوی ظفر علی خاں) نے بڑی مدد دی اور اس سے بڑا مواد ملا، جس سے اپنے مضامین و استدلال میں بہت کام لیا، برسوں کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامین ترجمان القرآن اور ان کی کتاب "تنقیحات" نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہونچائی۔

مولانا ابوالاعلیٰ کے ترجمان القرآن کے مضامین نے طرز استدلال اور طرز تحریر پر بڑا اثر ڈالا اور ان کی تحریروں نے ذوق و فکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اُس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی واصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پُر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب (Islam at the cross roads) معلوم ہوئی، جس کا لفظ لفظ دل نشین ہوا۔

۳۸-۱۹۳۹ء میں مصر کے فاضل مولف احمد امین کی فجر الاسلام ا-جلد او ر ضحی الاسلام ۳ جلد کے مطالعہ کا موقع ملا، یہ عہد نبوی اور عہد اموی وعباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی وعلمی تاریخ ہے۔ جس میں واقعات سے نتائج اخذ کئے ہیں، جزئیات سے کلیات قائم کئے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے، کتاب مصنف کی سلامت فکر، قوت ملاحظہ اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے اور اگرچہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیۃً پاک نہیں مگر مصر کے موجودہ ادب میں اپنی اسلامیت اور صحت فکر میں ممتاز رہے، اکثر جگہ خیالات میں بڑا توارد معلوم ہوا کہیں جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا یا مصنف کو بے اختیار داد دی۔

مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل ودماغ پر قائم ہوئی، "تذکرہ" اور الہلال کے ادبی "سحر حلال" نے مسحور کیا، ترجمان القرآن کی دوسری جلد سے تفسیر وفہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی تمام تصنیفات نقد کامل عیار اور علم و انشا کے لحاظ سے معیاری رہیں لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خطبات مدراس ہے، اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے تو اس کو زندۂ جاوید بنادے اور اگر مقبول ہو (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے) تو مغفرت کے لئے تنہا کافی ہے، بار بار مزے لے لے کر پڑھی، حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

حیات جاوید، وقار حیات اور تہذیب الاخلاق کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی و سیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب کی حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی۔

ہندوستان کی اسلامی، دینی و علمی تاریخ کا سب سے بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا، کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایۂ حیات نزہۃ الخواطر کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں، ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ

آنکھوں کے سامنے آگئی۔ علماء و مشائخ اہل درس و اہل تصنیف، اہل ذوق و اہل کمال، سلاطین و وزراء، امراء و رؤساء کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی نوادر و نکات مفت میں مل گئے جن کے لئے سیکڑوں کتابیں اُلٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا' یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا، جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو نظر انداز نہیں کر سکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔

علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا استفادہ نہیں کیا اور مضامین اور تحریروں میں کسی سے اتنا کام نہیں لیا جتنا نزہۃ الخواطر کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لئے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔

میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کر سکا۔ لیکن اللہ اُن کو کروٹ کروٹ آرام پہونچائے وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

ایک دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا۔ علامہ مرحوم سے

۱۹۳۳ء میں دوسری ملاقات کی اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" کے عنوان سے شائع ہوا، بلاد عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول رہتا اور ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا، علامۂ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لئے ایک مفصل و طویل مضمون علامۂ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا، اشعار ورد زبان تھے اور ان کی کتابیں ہر وقت کی ہمدم و ہم نشین پھر تنبہ ہوا کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں، محسوس ہوا کہ یہ ذوق قرآن مجید کے اشتغال اور ذوق پر غالب آرہا ہے۔ رفتہ رفتہ دوسرے مشاغل اور ذوق اس پر غالب آئے لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب "مذہب و عقلیات" پر نظر پڑی جس کو ذوق و ذہن نے پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی اور کوتاہی و ناپائداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ جس قدر پڑھا، ان ھم الا یخرصون اور کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم

تاویلہ کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی، حافظ ابن تیمیہ کی سورۂ اخلاص اور کتاب النبوات کے اشارات سے مزید مدد ملی لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم و مربی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ادام اللہ ظلہم، جن کی اصابت رائے، خداداد سلامت فکر، استقامت اور گہرا علم و نظر زندگی کی ہر منزل اور ہر موڑ پر میرا دست گیر رہا۔ برابر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے لیکن نوعمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحہ سے زیادہ نہ پڑھ سکا، دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کو لکھا ہے اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا۔ اور جس طرح بدشوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے ہیں میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ اس کا عزم کیا کہ مکتوبات کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کے چاروں دفتر پڑھے۔ لفظ بہ لفظ دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے، بے استعدادی، قوت مطالعہ کی کمی اور علوم عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ع آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است،

علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آگیا، وحی و نبوت کی قطعیت، مقام نبوت منصب رسالت کی بلندی و برتری اور خصائص نبوت و انبیاء اور نبوت و ولایت کے لوازم و مابہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں ان پر دقت فکر کے لحاظ سے یونان و عجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار۔ مکتوبات کے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارہ میں جو مجددانہ کلمات و تحقیقات قلم سے نکلی ہیں اُن سے بڑا اشرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا۔ نیز دور اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گزر چکا ہے۔ کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی مکتوبات میں پائی، جس پر تین سو سال گزر چکے مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھنے کے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیق کار مولانا منظور صاحب نعمانی نے "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو اس بے بضاعت سے بھی فرمایش کی کہ اس میں حصہ لے، میں نے شاہ ولی اللہ صاحب بہ حیثیت مصنف کا عنوان اپنے لئے منتخب کیا۔

اس کے لئے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے

کچھ پہلے دیکھی تھیں کچھ نہیں دیکھی تھیں اس سلسلہ میں ازالۃ الخفاء کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ اپنی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا، انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا جتنا مکتوبات اور ازالۃ الخفاء سے، علم کا چشمہ اُبلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے، آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمی پختگی کے ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے؟

حجۃ اللہ البالغہ میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے پڑھی تھی اور دماغ پر اس کی عقلیت، محکم استدلال اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا۔ حجۃ اللہ البالغہ سے علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا۔

شاہ اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرۂ آفاق اور مسلّم ذکاوت اور وفور علم کا اندازہ صرف منصب امامت سے ہوا جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مختصر تصنیف الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (جس کو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاض کہتا ہوں) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ وتفسیر میں بڑی رہنمائی کی اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے اور مطالعۂ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

سید صاحبؒ کے ملفوظات کے مجموعہ صراط مستقیم (مرتبۂ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) کو بہت دیر میں دیکھا مگر تصوف کے اچھے ذخیرہ اور ائمۂ تصوف کے ملفوظات خصوصاً حضرات چشت کے پورے سلسلۂ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے، سلوک راہ نبوت اور تقرب بالفرائض کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے اور جو اس عصر کے لئے تزکیۂ نفس اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہ راہ ہے، طریقت وحقیقت اور سلوک و تربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں وہ خدا داد ذکاوت، علوم نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت اور دقت نظر کی دلیل ہیں، اہل ظاہر و باطن اور اہل معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں وہ ان کی اعلیٰ سلامت طبع، دماغی توازن واعتدال اور میانہ روی کی شاہد ہیں، کاش اس کتاب کی شایانِ شان خدمت ہوتی اور نئے طرز پر

مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، دور ہوئی، اس کی بُری بھلی تمیز پیدا ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم وحقائق ادا کئے جا سکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کیے جا سکتے، ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو اور حواشی نہ ہوں۔

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ (م ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء) سے ملا تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتاً سہولت ہوئی۔ حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی، میں نے ایک موقع پر عرض کیا، کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات نہ لکھے ہوتے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی مولانا نے اس کو پسند فرمایا اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے، درسی و متداول اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں

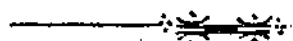
بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں لیکن اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت و مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کان خلقہ القرآن کا مظہر تو ہو اور جنھوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی و نکھار، وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے، کئی الفاظ جو لسان العرب اور مفردات غریب القرآن سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر کشاف امام رازی کی عقلی تفسیر فتوح الغیب اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں، الفاظ و معانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں اُن پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے، انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں ان کا احساس ہوتا ہے، قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیے ہیں کان وہی آوازیں سنتے ہیں اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں جو اشکال

اور تشبیہات علم کلام کی کتابوں نے اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیے ہیں وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سُنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے، انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ادبار اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی۔ سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش و نگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں جن میں رنگ ہے خوشبو نہیں، انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے، ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہونچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

دادیم ترا از منزل مقصود نشاں گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی



فہرست کتب

یعنی اُن کتابوں کی فہرست بہ ترتیب حروف تہجی جن کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے

۱ - اُردو خواں طبقہ کی سہولت کے پیش نظر عربی کی وہ کتابیں جو الف لام سے شروع ہوتی ہیں حرف الف میں داخل کی گئی ہیں ۔

۲ - انگریزی کتابوں کا اُردو نام اگر صاحب مضمون نے خود لکھ دیا ہے تو اسی اردو نام کو اختیار کیا گیا ہے ۔

۳ - عام انگریزی کتابوں کا اُردو تلفظ فہرست میں لکھا گیا ہے ۔

۴ - ایک ہی صفحہ پر اگر کسی کتاب کا ذکر کئی بار آیا ہو تو فہرست میں صرف ایک مرتبہ ذکر کیا گیا ہے ۔